هو العلیم الخبیر

کتب خانہ ندوۃ العلماء لکھنؤ

ملکیت خاص ....

نمبر کتاب	نام کتاب	فن	نام مصنف	مطبوعہ یا قلمی	قیمت	دستخط مہتمم کتب خانہ
١٥٢٩ / ٣٥٠١٩	تعمیر حیات لکھنؤ پندرہ روزہ	جرائد	ایڈیٹر جناب مولانا محمد الحسنی الندوی			

نوٹ: ہر کتاب یا جلد پر کچھ لکھنا یا خراب کرنا جرم ہے۔
کسی خرابی پر کتاب کی پوری قیمت وصول کی جاسکتی ہے۔

شعبہ تعمیر و ترقی
دار العلوم ندوۃ العلماء
لکھنؤ

تعمیرِ حیات
لکھنؤ

پندرہ روزہ

ایڈیٹر محمد الحسنی

۲۲ جمادی الثانی سنہ ۱۳۸۳ھ مطابق ۱۰ نومبر سنہ ۱۹۶۳ء

۱۵۲۹
۳۵۰۱۹
جرائد

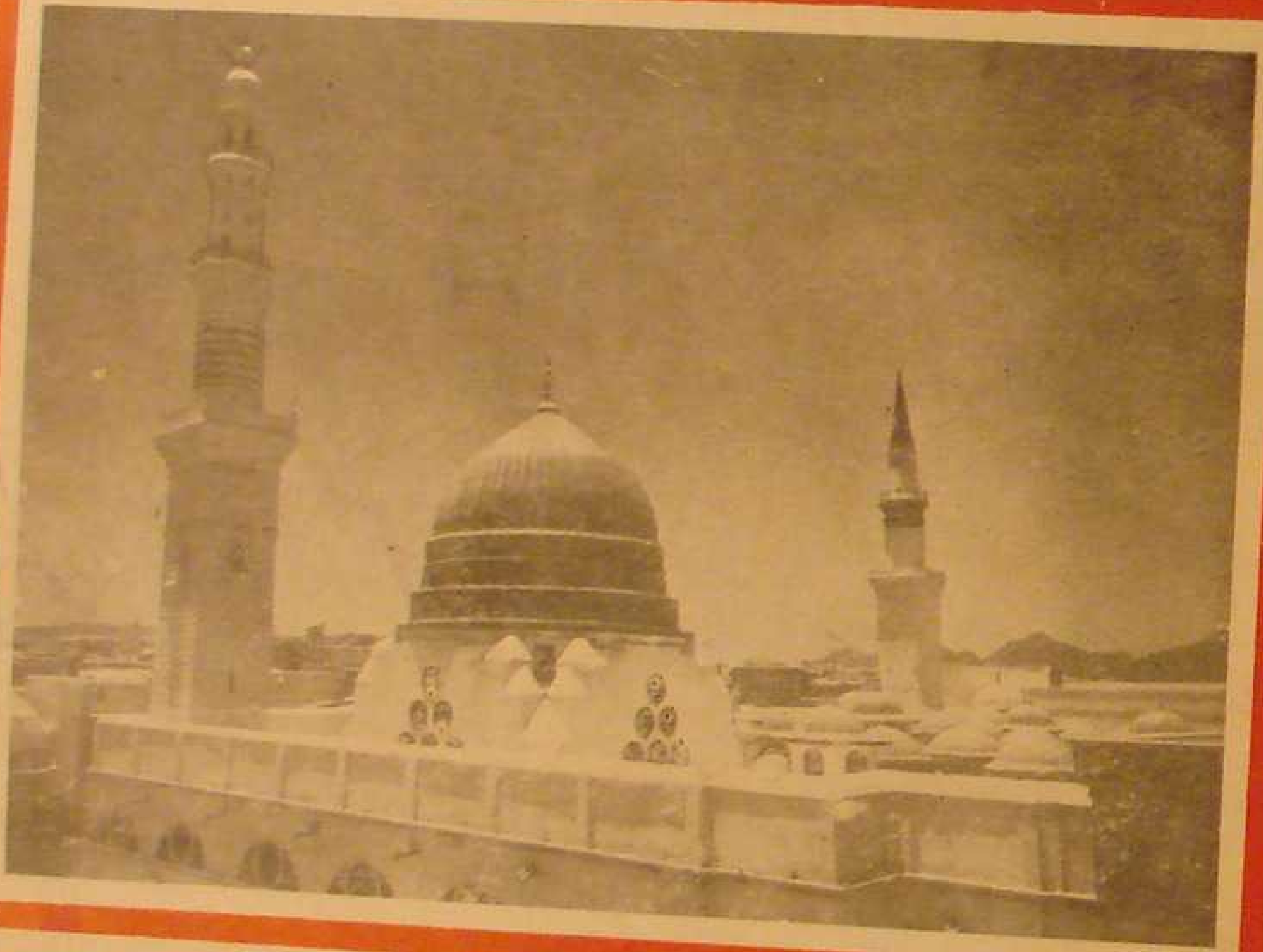

تمنا ہے درختوں پر ترے روضہ کے جا بیٹھے ✻ قفس جس وقت ٹوٹے طائرِ روحِ مقید کا (شہیدی)

اس شمارہ کی ایک جھلک

تجدید عہد • ایک قدیم ملی تحریک اور اسکے احیاء کی ضرورت • مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا ایک اہم مکتوب • ایسی چنگاری بھی یارب اپنے خاکستر میں تھی • آج کا دار العلوم • عالم اسلام • سائنس کی دنیا وغیرہ

سالانہ چندہ ۵ روپئے

مجلس مشاورت

مولانا محمد اویس ندوی، شیخ التفسیر دار العلوم ندوۃ العلماء

مولانا محمد اسحاق ندوی، استاذ حدیث دار العلوم ندوۃ العلماء

مولانا ابو العرفان ندوی، قائم مقام مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء

مولانا معین اللہ ندوی، ناظر شعبۂ تعمیر و ترقی دار العلوم ندوۃ العلماء

مولانا محمد رابع ندوی، ادیب اوّل دار العلوم ندوۃ العلماء

سالانہ چندہ ۵ روپئے ششماہی ۳ روپئے — فی کاپی ۲۵ نئے پیسے — ممالک غیر کے لیے (ایک پاؤنڈ اسٹرلنگ)

ترسیل زر و انتظامی امور کے لئے پتہ

منیجر "تعمیرِ حیات" شعبۂ تعمیر و ترقی دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

مضامین وغیرہ کے لئے خط و کتابت اِس پتہ پر کی جائے

اڈیٹر "تعمیرِ حیات" شعبۂ تعمیر و ترقی دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

پندرہ روزہ

تعمیرِ حیات لکھنؤ

شعبۂ تعمیر و ترقی دار العلوم ندوۃ العلماء

جلد (۱) | ۲۲ جمادی الثانی ۱۳۸۳ھ مطابق ۱۰ نومبر ۱۹۶۳ء | شمارہ (۱)

اِس شمارے میں

۱۔ تجدیدِ عہد ——— اڈیٹر

۲۔ قرآن کا پیام ——— مولانا محمد اویس ندوی

۳۔ کلام خیر الانام ——— مولانا محمد اسحٰق ندوی

۴۔ ایک قدیم مذہبی تحریک اور اسکے احیاء کی ضرورت ——— مولانا محمد اویس ندوی

۵۔ مکتوبِ یورپ ——— مولانا سید ابو الحسن علی ندوی

۶۔ مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کے دورۂ یورپ کے تاثرات ۔۔۔۔۔

۷۔ "کون رہ بتلا سکے جب خضر بہکانے لگے" ———

۸۔ آج کا دار العلوم ———

۹۔ "ایسی چنگاری بھی یارب اپنے خاکستر میں تھی" ———

۱۰۔ "اِک خیال آگیا اور آنسو رواں" ——— مولانا محمد ثانی حسنی

۱۱۔ وقت کا ایک اہم تقاضا ——— مولانا محمد تقی امینی

۱۲۔ تاریخ کے دریچے سے ——— مولانا ابو العرفان ندوی

۱۳۔ ایک پاکیزہ محفلِ مشاعرہ (مطالعہ کی میز پر) ——— مولانا عبد الماجد دریابادی

۱۴۔ مولانا ولایت علی صاحب عظیم آبادیؒ ——— مولانا محمد ثانی حسنی

۱۵۔ عالمِ اسلام ——— سعید الرحمٰن اعظمی

۱۶۔ سائنس کی دنیا :۔ البرٹ روزنفیلڈ ——— (ترجمہ) سید ضیاء الحسن ندوی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تجدیدِ عہد

کچھ یادیں ٭ کچھ عزائم

——— محمد الحسنی

آج پھر ہم اس عہد کی تجدید کرتے ہیں جو ہندوستان کے مخلص اور روشن ضمیر علماء نے آج سے ستر برس پہلے کانپور کے مدرسہ فیض عام میں کیا تھا، وہ یقیناً ایک مبارک و تاریخی گھڑی تھی جس کو ہندوستان کی اسلامی تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔

انھوں نے اپنی ایمانی فراست سے وقت کی جس آواز کو سمجھا تھا، اور اپنی نگاہ بصیرت سے جن انقلابات و تغیرات کا مشاہدہ کیا تھا اُس کا عمل ابھی ختم نہیں ہوا۔ بیسویں صدی کے اس نصف آخر میں بھی (جو الحاد و بے دینی اور غیر اسلامی نظریات و تحریکات کی سخت یورش کا عہد ہے) ان کی جلائی ہوئی شمع روشن ہے اور ماحول کی کثافت اور تاریکی کے ساتھ ساتھ اس کی روشنی بھی برابر بڑھتی جا رہی ہے۔

یہ در اصل اس عہد کی تجدید ہے کہ ندوۃ العلماء نے جو دعوت، نصب العین، اور نظام عمل مسلمانوں کے سامنے پیش کیا تھا اور جس نے ان کے اندر زندگی کی ایک نئی لہر پیدا کر دی تھی وہ دعوت اور نصب العین ایک طرف علوم نبوت کا حامل و داعی اور شارح و ترجمان، اور مسلمانوں کی معاشرتی و دینی اصلاح، رفع نزاع باہمی اور اخوت اسلامی کا آئینہ دار ہے، اور دوسری طرف مغرب کے چیلنج کا ٹھوس اور علمی جواب بھی ہے، یہ اسکے دو ایسے شہپر ہیں جو اس کی بلند اور نتیجہ خیز پرواز کے لئے ضروری ہیں۔ وہ نہ مرعوبیت کا قائل ہے نہ فرار کا داعی، نہ مغربی علوم اور مادی وسائل و ترقیات کا بالکلیہ منکر ہے نہ اس کا مقلد جامد اور خوشہ چیں، وہ نہ ان علوم و وسائل اور صنعتی ترقیات سے وحشت رکھتا ہے نہ ان سے مقاصد کا سا معاملہ کرنا چاہتا ہے۔ وہ مغربی تہذیب کی قوت و وسعت، جاذبیت اور اثر انگیزی کا معترف بھی ہے اور اسکے معنوی افلاس، باطنی ظلمت اور بے مقصدیت اور بے یقینی کی اس کیفیت سے بھی واقف ہے جو یورپ کے حسین و جمیل مظاہر کے اندر پوشیدہ ہے اور جس نے اس کو حقیقی سکون، قلبی اطمینان اور باطنی مسرت سے یکسر محروم کر رکھا ہے۔

ندوۃ العلماء کے یہ دو ایسے بازو ہیں جو اس کی متوازن ترقی و پیش قدمی کے لئے بے حد ضروری ہیں، اور ان دونوں کے صحیح تناسب کو ملحوظ رکھنا ندوہ کے ہر طالب علم، ہر ذمہ دار اور ہر بہی خواہ کا فرض ہے۔

ندوۃ العلماء کو اپنی قیادت و رہنمائی اور تعمیر و ترقی کے لئے ایک ایسے شخص کی ضرورت تھی جس میں نہ حلقۂ مدارس کی طرح ہر جدید سے نفرت اور ہر قدیم سے محبت ہو، اور نہ جدید طبقہ کی طرح وہ مغرب کی ذہنی غلامی میں مبتلا اور اندھی تقلید کا شکار ہو، نہ اس میں جزئیات اور غیر ضروری اشیاء پر بیجا اصرار ہو، اور نہ

حکمت کی باتیں

"معاصرت"

بزرگان دین اور مشائخ کے تذکرہ میں اکثر یہ روایت دہرائی گئی ہے کہ ایک بزرگ اپنے شیخ کے حکم سے یا اشارۂ غیبی سے کسی علاقہ میں تشریف لے گئے اور وہاں قیام کرنے کا فیصلہ فرمایا۔ وہاں ایک بزرگ پہلے سے مقیم اور ارشاد و تربیت میں مشغول تھے، انھوں نے پانی کا ایک بھرا ہوا پیالہ ان نو وارد بزرگ کی خدمت میں بھیجا، اشارہ تھا کہ پیالہ لبالب ہے، اب اس میں کسی اضافہ کی گنجائش نہیں۔ ان نو وارد بزرگ نے اس میں ایک گلاب کا پھول ڈال دیا، اشارہ تھا کہ میں اسی طرح سے رہوں گا جیسے پھول پانی پر تیرتا ہے۔

——— (سوانح حضرت مولانا عبد القادر رائے پوری)

دین کے بنیادی اور ضروری اجزا میں نرمی اور مداہنت، وہ ایک طرف زمانہ کا نبض شناس ہو، ملک کے سماجی اور عقلی تغیرات اور نئی نسل کی نفسیات سے بخوبی واقف ہو، دوسری طرف ایمان و یقین کا حامل و داعی، معرفتِ الٰہی کا محرم اسرار اور رشد و ہدایت اور اصلاح و تربیت کا قافلہ سالار بھی ہو۔

خوش قسمتی سے ندوۃ العلماء کی تاسیس و قیادت ایک ایسے ہی شخص کے حصہ میں آئی، جس میں یہ تمام صفات موجود تھیں، میری مُراد مولانا سید محمد علی مونگیری (خلیفہ حضرت مولانا فضل رحمٰنؒ) سے ہے جنھوں نے ۱۳۱۱ھ میں ندوۃ العلماء کی بنیاد ڈالی، اور اسکے بعد دس سال سے زائد عرصہ تک اپنے خونِ جگر سے اس کی آبیاری کرتے رہے۔

مولانا کے روحانی کمالات، باطنی حالات اور اصلاحی و دعوتی خدمات سے قطع نظر جس کے ذکر کے لئے نہ یہ جگہ کافی ہے نہ موزوں۔ .. ..

.. .. .. مولانا نے ندوۃ العلماء کی ضرورت پر جس سادگی، خلوص، دردمندی اور صفائی کے ساتھ جگہ جگہ توجہ دلائی ہے وہ انھیں کا حصہ ہے۔ ایک موقع پر اس موضوع پر اس طرح قلم اٹھاتے ہیں:۔

"بڑی ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک جماعت علماء کی دنیا کے حالات و واقعات سے بھی باخبر ہو اس کو معلوم ہو کہ جس سلطنت میں وہ بسر کرتی ہو اس کے اصول سلطنت کیا ہیں، اس کو سلطنت سے کس قسم کا تعلق ہے۔ .. .. .. ملک میں علماء کا جو اثر کم ہوتا جا رہا ہے اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ خیال عام طور پر پھیلتا جا رہا ہے کہ علماء حجروں میں معتکف ہیں ان کو دنیا کے حال سے بالکل خبر نہیں اسلئے دنیاوی معاملات میں انکی ہدایت اور ان کا ارشاد بالکل ناقابلِ التفات ہے۔"

آگے لکھتے ہیں:۔———

"بے شبہ اصحابِ صفہ کے مشابہ ایک گروہ ہمیشہ قوم میں موجود رہنا چاہئے لیکن اس کے ساتھ نہایت ضرور ہے کہ ایک جماعت کثیر ایسی بھی موجود ہو جو واقفیت و اطلاع، حزم و مصلحت اندیشی میں حضرت عمرؓ، عمرو بن العاصؓ، خالد بن ولیدؓ، ابو عبیدہ بن جراحؓ کے نقشِ قدم پر ہو۔"

اسی طرح جدید تمدنی اور معاشرتی مسائل کو سمجھنا جو مغربی تہذیب ہمیشہ ہر ملک میں پیدا کرتی ہیں اور زمانہ کی ضرورتوں اور جدید تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان مسائل کا حل پیش کرنا جو اسلامی معاشرہ کو چیلنج کرتے ہیں اس وقت بھی مولانا کی نظروں سے اوجھل نہ تھا، بلکہ یہ مسئلہ مولانا کے نزدیک وقت کا اہم ترین مسئلہ تھا، مولانا نے اس کا ایک مفصل خاکہ ۱۳۱۳ھ کے جلسۂ انتظامی میں پیش

کیا تھا، اس میں ایک جگہ مولانا لکھتے ہیں:۔———

"جو وقت میں نے فقہ میں بیان کی وہ علمی حیثیت سے تھی، مگر ایک اور وقت اس میں ہمارے علماء کیلئے یہ ہے کہ زمانہ کے حالات پر ان کی نظر نہیں، دنیا کے معاملات سے اکثر ناواقف، انکی پیچیدگیوں کو سمجھنا دشوار، جب فقہاء تصریح کرتے ہیں کہ زمانہ کے بدل جانے سے احکام بھی بدل جاتے ہیں تو ضروری ہوا کہ مفتی زمانہ کی حالت سے بھی واقف ہو اور اس طرح جب تک معاملات سے واقف نہ ہوگا اور اس کی پیچیدگیوں پر مطلع نہ ہوگا تو صحیح جواب کیونکر دے گا الخ۔"

مسلمانوں کی عمومی اور معاشرتی اصلاح ابتداء ہی سے ندوۃ العلماء کے پیش نظر رہی، اور اسنے رفع نزاع باہمی، رسوم قبیحہ کا انسداد، اور معاشرتی اصلاح کے میدان میں بڑی خدمات انجام دیں مولانا ابراہیم آروی اور مولانا شاہ امانت اللہ صاحب غازیپوری کا عہد نامۂ اتفاق جو اس زمانہ کا ایک اہم واقعہ تھا اس میدان میں ندوہ کا پہلا ثمرہ کہا جا سکتا ہے جو اسکے قیام کے دوسرے ہی سال حاصل ہو گیا اور اس کا ان کثیر مسلمانوں پر بہت خوشگوار اثر پڑا جو ان دونوں کے زیر اثر تھے۔

ندوہ کی رودادوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۳۱۳ھ تک ندوۃ العلماء کی طرف سے ہندوستان کے متعدد علاقوں میں ایسی انجمنیں قائم ہو چکی تھیں جن کا مقصد مسلمانوں کی دینی و دنیاوی تعلیم کا انتظام اور رسوم وغیرہ کا انسداد تھا، اسکے علاوہ مبلغین کی کوششوں سے جو اسی مقصد کے لئے تیار کئے جاتے تھے ہندوستان کے دور دراز علاقوں میں بڑے بڑے خاندانوں اور گھرانوں میں اصلاح ہوئی، اور اس کی وجہ سے برسوں پرانے اختلافات اور جاہلانہ روایات کا خاتمہ ہوا۔

نصاب کے میدان میں جو کام ہوا وہ ندوۃ العلماء کی تاریخ کا روشن اور تابناک ورق ہے۔ مولانا محمد علیؒ کے پیش کردہ نصاب تعلیم اور مجوزہ نقشہ دار العلوم اور ان کے نامور رفقاء مولانا شبلیؒ، مولانا شروانیؒ، مولانا سید عبد الحی وغیرہ کی کوششوں نے ندوۃ العلماء کو ایک نئے نظام تعلیم سے آشنا کیا، جو قدیم و جدید کے محاسن کا جامع اور دونوں کے عیوب سے پاک تھا۔ بالخصوص مولانا شبلیؒ اور ان سے بڑھ کر مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اسکے دامن کو عطر بیز اور خوش رنگ پھولوں اور آبدار موتیوں سے بھر دیا جنکی آب و تاب اور چمک دمک آج بھی نظروں کو خیرہ کر رہی ہے، اگرچہ اس سلسلہ میں اب بھی بہت کام باقی ہے اور زمانہ کے ساتھ ساتھ ندوۃ العلماء کی ذمہ داریاں بھی برابر بڑھتی جا رہی ہیں۔

نصاب تعلیم میں اس قدر تبدیلیاں ہونے کے باوجود اب بھی اس میں انقلابی تغیرات بلکہ اس کو نئے سرے سے ڈھالنے کی ضرورت ہے

حقائق سے گریز اور واقعات سے چشم پوشی کسی خامی اور کمی کا ازالہ نہیں کر سکتی، اور دیر سویر یہ پردہ چاک ہو کر رہتا ہے۔

اسی طرح تحقیقات شرعیہ کے میدان میں ایک نئے سفر کا آغاز کرنا ہے اور اس کی ساری مشکلات اور الجھنوں کو برداشت کرنا ہے اس میں جس قدر دین کے صحیح فہم اور توازن، تحمل اور دقیقہ رسی کی ضرورت ہے وہ اہل نظر سے مخفی نہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ مولانا مونگیریؒ کا دیکھا ہوا خواب اب شرمندۂ تعبیر ہوتا نظر آ رہا ہے اور مجلس تحقیقات شرعیہ کے نام سے ایک باضابطہ ادارہ کا وجود اسی کام کے لئے عمل میں آ چکا ہے۔

جدید تعلیم یافتہ طبقہ سے ربط و اتصال اور اس کو جدید تقاضوں کی روشنی اور جدید اسلوب میں اسلام کی دعوت دینے اور اسکے دل اور دماغ کو بیک وقت متاثر کرنے کے لئے مجلس تحقیقات و نشریات اسلام کے نام سے ایک اہم تصنیفی و اشاعتی ادارہ کئی سال سے قائم ہے اور اسنے ملک میں اپنی ایک وسیع جگہ بنالی ہے۔

ہماری نظر کے سامنے مستقبل کی جو درخشاں تصویر جلوہ گر ہے اس کی تصویر و تعبیر اس پرچہ میں کسی اور جگہ یا آئندہ صحبتوں میں کی جاتی رہے گی، اور ہمارے آپ کے درمیان ربط و تعارف کا یہ نیا سلسلہ انشاء اللہ دراز ہوگا۔

ایڈیٹر نے اس طویل داستان سے یقیناً کچھ لوگوں کی حق تلفی کی لیکن آج کے دن کے لئے اسکے پاس اس سے بہتر کوئی پیغام نہ تھا۔ "تعمیر حیات" کے آغاز کے ساتھ اس نصب العین اور تخیل کا ذکر لازمی تھا جس کی تبلیغ و اشاعت کے لئے اور جس کے نام پر اس کا اجراء ہو رہا ہے۔

آخر میں یہ عرض کر دینا بھی ضروری ہے کہ ندوۃ العلماء درحقیقت قدیم و جدید کی مصنوعی تقسیموں اور سطحی بحثوں سے بالاتر ہے قدیم و جدید کا حقیقت میں کوئی وجود نہیں۔ اسلام نہ قدیم ہے نہ جدید، نہ مشرقی ہے نہ مغربی، نہ ندوی ہے نہ دیوبندی، نہ علیگڑھی ہے اور نہ کچھ اور۔ وہ پانی، ہوا، اور غذا کی طرح ہر زمانہ میں یکساں، ہر شخص کے لئے ضروری، اور آفتاب کی طرح ہمیشہ سے زندہ و تابندہ ہے۔ وہ ایک ازلی اور ابدی آسمانی پیغام ہے جو زمانہ و تاریخ، زبان و ادب اور معاشرت و اجتماع کے اثرات سے آزاد اور ماوراء ہے، اس لحاظ سے ندوۃ العلماء کی دعوت کو بھی قدیم و جدید کے چھوٹے چھوٹے پیمانوں سے ناپنا درست نہیں، جو عین اسلام کی دعوت، علوم نبوت کی ترجمانی و اشاعت اور انبیاء علیہ السلام کی نیابت و وراثت ہے۔

———

کچھ اپنی باتیں:۔

"تعمیر حیات" آپ کے ہاتھ میں ہے، ناسپاسی ہوگی اگر اس موقع پر ان حضرات کا ذکر نہ کیا جائے جو اسکے (بقیہ ص پر)

قرآن کا پیغام

از مولانا محمد اویس ندوی شیخ التفسیر دار العلوم ندوۃ العلماء

یعلمون ظاہرًا من الحیاۃ الدنیا وھم عن الاٰخرۃ ھم غافلون۔ (سورۂ روم)

یہ لوگ صرف دنیاوی زندگی کے ظاہر کو جانتے ہیں اور آخرت (محض) بے خبر ہیں۔

قرآن مجید ایک نسخۂ شفا ہے، اسلئے اس کی نظر ان امراض پر بھی رہتی ہے جو بنی نوع انسان کی فکری اور عملی صلاحیتوں کو برباد کرتے رہتے ہیں۔ ایک مہربان طبیب کی طرح اس کا فرض ہے کہ وہ اس قسم کی مہلک بیماریوں کی نشاندہی کرے، اور اس سے بچنے کے طریقوں سے بھی خبردار کرے۔

آیت بالا میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے بندوں کو ایک ایسے خطرناک مرض سے ہشیار کیا ہے کہ جو اس مرض میں مبتلا ہوا وہ "قلب روشن" اور "چشم بینا" سے محروم ہو گیا اور اسی "بے بصری" اور "کور باطنی" نے ہمیشہ کیلئے اس پر حق و صداقت کے دروازوں کو بند کر دیا ———

اس بیماری کی پہلی منزل یہ ہے کہ:۔

یعلمون ظاہرًا من الحیاۃ الدنیا

یہ لوگ صرف دنیاوی زندگی کے ظاہر کو جانتے ہیں۔

یعنی انسانی علم، صرف دنیاوی زندگی کی اوپری باتوں تک محدود ہو جائے، اور اس سے آگے کی منزل سے وہ بے خبر ہو جائے۔

بے شبہ جب تک انسان اس عالم رنگ و بو میں ہے، اس کو اپنی انفرادی اور اجتماعی ضروریات سے متعلق اس کائنات کا علم ضروری ہے، اور یہ ہرگز کوئی غلط بات نہیں ہے لیکن شکوہ تو اس وقت ہے کہ جب انھیں چند معلومات کو اپنی زندگی کا مقصود قرار دے لیا جائے، اور علم و فضل کا معیار انھیں اوپری باتوں کو مان لیا جائے۔

قرآن مجید انسان کی اس کم ہمتی، کوتاہ بینی اور گراوٹ پر اعتراض فرماتا ہے، اسکے نزدیک انسان کا منصب اس سے کہیں زیادہ عزم و ہمت اور بلندی کا طالب ہے!

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاج تنگیٔ داماں بھی ہے

آج دنیا کی چھوٹی اور بڑی تعلیم گاہوں کا جائزہ لیا جائے تو "یعلمون ظاہرًا من الحیاۃ الدنیا" کی پوری تفسیر سامنے آ جائے گی۔ ان درسگاہوں میں وہ سب کچھ ملے گا جو انسان کی اوپری زندگی سے متعلق ہے، انسانی زندگی میں سب سے قیمتی چیز اس کی صحت و تندرستی ہے آپ کو طب یونانی کے مدارس، اور میڈیکل کالجوں میں انسان کے ایک ایک عضو کی بیماریوں اور اسکے نئے نئے طریقۂ علاج کے متعلق انتہائی قیمتی سامان ملے گا، معاشی زندگی کو علم و فن کی حیثیت سے سدھارنے کے لئے بے شمار نظامہائے تعلیم نظر آئیں گے۔ یہ صنعتی کالج ہے، اور اس سے متعلق بے شمار شعبہ جات ہیں۔ یہ زرعی درسگاہ ہے، یہ بھی زراعت کی ترقی کے لئے اپنے پاس گوناگوں پروگرام رکھتی ہے۔ یہ عام اسکول، کالج اور یونیورسٹیاں ہیں، یہاں جغرافیہ، تاریخ، حساب، زبان، منطق، فلسفہ، سائنس، سیاسیات، علم نباتات، علم الحیوانات غرض ہر شعبۂ زندگی کے متعلق آپ کو تعلیم کا انتظام ملے گا، کتب خانوں میں چلے جائیے بالکل یہی نقشہ وہاں بھی نظر آئے گا۔ لیکن علم و فن کے اس دور میں بھی علم کی طاقت پرواز اس کے آگے نہیں ہے!۔

مگر سوال یہ ہے کہ قرآن مجید کو آخر اس علم و فن میں کیا کمی نظر آتی ہے؟ اور وہ انسان کو اس سے آگے کہاں دیکھنا چاہتا ہے؟۔ درحقیقت اسی سوال کا جواب ہے جس کو آیت بالا میں انسانی بیماری کو اس کی دوسری منزل قرار دیا جا سکتا ہے۔

وھم عن الاٰخرۃ ھم غافلون

اور آخرت سے (محض) بے خبر ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دنیا کے تمام اعمال اور اسکے نتائج کی اصلی اور دائمی بنیاد آخرت کے یقین پر قائم ہے، اگر یہ یقین متزلزل ہو جائے تو انسانی اعمال کے نتائج کا ریشہ ریشہ بیخ و بن سے اکھڑ جائے۔

قرآن مجید کو موجودہ انسانی علم پر یہی اعتراض ہے کہ اس نے اپنے نظام تعلیم میں زندگی کے ہر پہلو کا لحاظ رکھا ہے اور اس کیلئے ہر طرح کی جد و جہد کی ہے، لیکن تعلیم کا وہ شعبہ جس سے زندگی کی حقیقی راہ کا سراغ ملتا ہے، جس سے انسانی قلوب روشن ہو جاتے ہیں، جس سے انسان اپنی منزلِ مقصود تک پہونچتا ہے، یہی نہیں کہ انسان اس علم سے ناواقف ہے بلکہ بے فکر ہے۔

بے شبہ آج دنیا کے مختلف گوشوں میں دینی مدرسوں اور خانقاہوں کے اندر کچھ چراغ جلتے ہوئے نظر آتے ہیں اللہ تعالیٰ ان چراغوں کو ان ہواؤں سے محفوظ رکھیں جو ان کو بجھانے کی فکر میں ہیں، لیکن غور کرنے کی بات ہے کہ ہمارا عمومی نظام تعلیم و تربیت کس سمت جا رہا ہے؟ ہمارا عام معاشرہ اسی عمومی نظام کے ماتحت بنتا ہے، اور یہ عمومی نظام تعلیم و تربیت آخرت کے تصور سے خالی اور محروم ہے، پھر انسانی زندگی میں سُدھار آئے تو کیسے آئے؟۔

انسان کے موجودہ نظام تعلیم کی اس بنیادی خرابی کے دو تکلیف دہ نتائج ہیں:۔

پہلا نتیجہ تو یہ ہے کہ علم و فن کی اس روز افزوں ترقی کے باوجود انسانی زندگی سے امن اور چین گم ہے، اخلاق فاضلہ حرف غلط کی طرح مٹ گئے ہیں، حقوق اور واجبات کا احساس نہیں ہے، اس کی وجہ یہی ہے کہ انسان کے موجودہ علم و فن میں "کل" کے احتساب کا کچھ تصور نہیں ہے، اور تجربہ شاہد ہے کہ جو نظام تعلیم و تہذیب "فکر فردا" سے خالی ہے، وہ انسانی اخلاق کو ہرگز نہیں سُدھار سکتا۔

دوسری سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ اس "آج" کے بعد اگر ایسا "کل" آیا جس میں انسان کو اپنے خدا کے حضور میں حاضر ہونا ہے اور اپنی پوری زندگی کا حساب دینا ہے اور ہمارے عقیدہ کے مطابق یقیناً ایسا ہونا ہے، تو اس وقت یہ نظام تعلیم اور یہ سلسلۂ تہذیب و تمدن انسان کے حق میں کیسا غیر مفید ثابت ہوگا، اس لئے کہ ہمارے موجودہ سرمایۂ علم میں "اس دن" کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔

مسلمانوں کو خصوصیت کے ساتھ موجودہ نظریۂ علم پر قرآن مجید کی اس تنقید پر غور کرنا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اپنی رغبت سے مقدور کے مطابق چند سکوں کو نکال کر دینی مدارس کے حوالے کر دینا ان کے لئے کافی ہے۔ حالانکہ صورت حال ہرگز ایسی نہیں ہے اگر ان کو آخرت پر یقین ہے اور اپنی ذات کے ساتھ اور اپنی اولاد کے ساتھ صحیح محبت ہے تو ایسے اصول سے کم از کم اتنا تعلق تو ضرور رکھنا چاہئے کہ آخرت کی منزلیں آسان ہوں اور روز جزا کی شرمساری سے نجات ملے۔

اگر کہ ہمارے ہمسائے قوم آیا
اور ایک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا
حق

کلامِ خیر الانام

از مولانا محمد اسحاق ندوی استاذ حدیث دار العلوم ندوۃ العلماء

بنی الاسلام علی خمس شہادۃ ان لا الٰہ الا اللہ وان محمداً رسول اللہ واقام الصلوٰۃ وایتاء الزکوٰۃ والحج وصوم رمضان۔

(بخاری جلد ۱ کتاب الایمان ص۶)

(ترجمہ) اسلام کی بُنیاد پانچ چیزوں پر قائم کی گئی ہے:—

(۱) اس بات کی گواہی دینا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔

(۲) نماز کا قائم کرنا۔

(۳) زکوٰۃ ادا کرنا۔

(۴) حج کرنا۔

(۵) رمضان کے روزے رکھنا۔

(تشریح) اسلام کی تعلیمات پوری انسانی زندگی پر حاوی ہیں لیکن ان میں سے جو حصہ سب سے زیادہ اہم اور بالکل بنیادی ہے اسے اس حدیث میں بیان فرمایا گیا ہے، اور ان میں سب سے زیادہ اہم حصہ پہلا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی توحید اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت و نبوت کا اقرار، اسکے بغیر کسی حصہ کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔ دل سے اس کا پختہ یقین رکھنا اور زبان سے اس کا اقرار کرنا مسلمان ہونے کے لئے ضروری و لازم ہے، اسکے بغیر کوئی شخص مسلمان نہیں ہو سکتا۔

یہ کلمۂ طیبہ جس کی شہادت اور جس کے اقرار کا حکم اس حدیث شریف میں دیا گیا ہے بہت ہی جامع کلمہ ہے جسکے ماتحت مسلمان کی پوری اعتقادی زندگی آجاتی ہے۔

لا الٰہ الا اللہ کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی ہستی بھی ایسی نہیں ہے جسے معبود بنانا اور جس کی کسی قسم کی عبادت کرنا جائز ہو، صرف اللہ تعالیٰ ہی اس لائق ہیں کہ انکی عبادت کی جائے۔ عبادت کے معنی ہیں معبود کی انتہائی تعظیم اور اس کے سامنے اپنی انتہائی ذلت و پستی کا اظہار، انتہائی عظمت کے معنی یہ ہیں کہ اس سے بڑھ کر عظمت کا کوئی درجہ تصور میں نہ آسکے، اور اپنی انتہائی پستی کے اظہار کے معنی یہ ہیں کہ اس سے زیادہ ذلت و پستی کا تصور بھی نہ ہو سکے۔ اللہ تعالیٰ کی عبادت کا مطلب یہی ہے کہ حق تعالیٰ جل شانہٗ کے متعلق انتہائی عظمت کا اعتقاد اور عملاً اس کا اظہار کیا جائے۔ اس کا نتیجہ صریح یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی ہستی کو بے مثل و بے نظیر مانا جائے، جیسا کہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:—

"لیس کمثلہ شیٔ"

اللہ تعالیٰ کے مثل کوئی شے بھی نہیں

دوسرا نتیجہ صریح یہ ہے کہ حق تعالیٰ جل شانہٗ کو ہر صفتِ کمال سے متصف اور ہر نقص و عیب سے پاک سمجھا جائے، کیونکہ وہی ہستی عبادت کی مستحق ہو سکتی ہے جس میں یہ دونوں باتیں موجود ہوں۔ اس اصولی اعتقاد پر غور کیجئے تو اس سے توحیدِ کامل کی روشنی ملتی ہے یعنی یہ بات بدیہی طور پر سمجھ میں آجاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ جل شانہٗ اپنی ذات اور اپنی ہر صفت کے اعتبار سے بے مثل و بے نظیر ہیں۔ جس طرح ان کی ذات کی ایسی کوئی ذات نہیں پائی جاسکتی اسی طرح ان کی کسی صفت کی ایسی کوئی صفت بھی کسی میں نہیں پائی جاسکتی۔ مثلاً اُن کے علم کا ایسا کسی کو علم نہیں، ان کی قدرت کی ایسی کسی کی قدرت نہیں، ہر جگہ حاضر و ناظر ہونا ان کی صفت ہے ان کے علاوہ کوئی بھی حاضر و ناظر نہیں۔ علیٰ ہذا القیاس۔ یہی توحیدِ کامل ہے جس کی اسلام نے تعلیم دی ہے، اور جس پر پختہ اور ناقابلِ رد یقین و اعتقاد رکھنا مسلمان ہونے کے لئے ضروری ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کی عبادت کرنا شرک ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کی کسی صفت کی ایسی کوئی صفت اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی دوسرے میں تسلیم کرنا خواہ وہ دوسرا اللہ تعالیٰ کا کوئی مقرب بندہ مثلاً نبی، فرشتہ، ولی ہی کیوں نہ ہو داخلِ شرک ہے۔

اس کلمۂ شہادت کا پہلا جز جس طرح توحیدِ کامل پر حاوی ہے اسی طرح اس کا دوسرا جز "محمد رسول اللہ" (صلی اللہ علیہ وسلم) دوسرے ضروری اسلامی عقائد پر حاوی ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کے معنی یہ ہیں کہ آنحضور کی ہر بات کی تصدیق کی جائے، اور جس بات کے متعلق یقین ہو جائے کہ یہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمودہ ہے اُس پر پختہ یقین و ایمان رکھا جائے۔ اسکے بعد یہ بات آسانی کے ساتھ سمجھ میں آجاتی ہے کہ قرآن مجید، جنت، دوزخ، قیامت، ختم نبوت اور دیگر اعتقادی امور پر ایمان اسی ایمان بالرسالت کے ماتحت آجاتا ہے، ان میں سے کسی ایک کا بھی انکار کیا جائے تو وہ رسالتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انکار کے مرادف ہوگا، اور ایسا شخص یقیناً اسلام سے خارج سمجھا جائے گا۔

اقامۃ صلوٰۃ کے معنی ہیں نماز کو سنوار کر پڑھنا یعنی اسکے آداب ظاہری و باطنی کی رعایت کرکے ادا کرنا، اس میں جس قدر کمی ہوگی اُسی قدر انسان کے اسلام میں کمی ہوگی، اگرچہ اس سے مسلمان دائرۂ اسلام سے خارج تو نہ ہوگا لیکن اُسکے اندر ایک نقص پیدا ہو جائے گا۔

شہادتین کے اقرار کے بعد اللہ کی عبادت اسکے لوازم میں ہے نماز عبادتِ بدنی ہے، اسکے بعد ایتاء الزکوٰۃ یعنی زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم ہے، جو عبادتِ مالی ہے، اور اس محبت کا تقاضہ ہے جو معبودِ حقیقی کے ساتھ فطرتاً ہوتی ہے۔ اس کا ایک خاصہ یہ ہے کہ اس سے حبِ مال کم ہوتی ہے، جو بہت سی برائیوں کی اصل ہے۔ زکوٰۃ صرف اُن لوگوں پر فرض ہے جو مالکِ نصاب ہیں۔

معبود محبوب کی محبت کا تقاضا یہ بھی ہے کہ جس بیت کی نسبت انھوں نے اپنی طرف خصوصیت سے کی ہے اس کی زیارت اور اس کی تعظیم کی جائے، جس کا نام حج ہے۔ یہ بھی صرف استطاعت رکھنے والوں پر فرض ہے۔

اپنے محبوب رب کی محبت کا تقاضا یہ بھی ہے کہ اس کی خوشنودی کے لئے اپنی مرغوب و محبوب چیزوں کو ترک کیا جائے، اور اسی معمولی سے "ترک" کو اس بات کا نمونہ بنایا جائے کہ ہم اپنے محبوبِ حقیقی کے لئے ہر دوسری محبوب چیز کو چھوڑنے کے لئے تیار ہیں۔ اسی ترک کا نام "صوم" ہے، جو ہر مسلمان پر فرض اور اسلام کا ایک اہم رکن ہے۔ یہ صرف رمضان میں فرض ہے یعنی ایک سال میں صرف ایک ماہ۔

بقیہ ص۱

مولانا کی کتابِ زندگی کا آخری اور زریں باب وہ ہے جو تعلق باللہ اور معرفت و محبت سے متعلق ہے اور جو ان کی اصل طاقت اور اُن کی ساری جدوجہد کی اصل قیمت تھی، روحانیت اور وسیع النظری اور قلب و دماغ کے حسین و خوشگوار امتزاج نے ان کو ندوۃ العلماء کے فرزندوں اور خادموں کیلئے ایک مثالی پیکر بنا دیا ہے، مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ نے اُن کے متعلق ایک مرتبہ فرمایا "ایسے لوگ ہر زمانہ میں کم ہوتے ہیں۔" ایک موقع پر مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ سے پوچھا گیا کہ کیا مولانا آپ کے خلیفہ ہیں؟ مولانا نے فرمایا، "ہم اس قابل نہیں ہیں کہ ہم ان کو خلیفہ کہیں، وہ بڑے شخص ہیں۔" ۱۳۲۳ھ کے آخر میں مولانا مونگیر میں مقیم ہوئے اور عمومی بیعت و اصلاح کا دور شروع ہوا۔ ان کے مریدین کی تعداد ۴ لاکھ بتائی گئی ہے، جس میں نہ صرف ہندوستان بلکہ افریقہ کے بھی بعض حصوں اور کابل، غزنی، خراسان، اور روس و چین تک کے طالب حق شامل ہیں۔

۱۳۴۶ھ، ۱۹۲۶ء میں وفات پائی اور مونگیر ہی میں مدفون ہوئے

ایک قدیم مذہبی و اصلاحی تحریک

اور

اسکے احیاء کی ضرورت

از مولانا محمد اویس ندوی شیخ التفسیر دار العلوم ندوۃ العلماء

ہجری حساب سے ۱۳۱۰ھ اور عیسوی حساب سے ۱۸۹۲ء ہے۔ اس سال مدرسہ فیض عام کانپور کی چٹائی پر مدرسہ مذکور کے چند فارغ التحصیل طلبہ کی دستار بندی کیلئے وہ نفوس قدسیہ جلوہ افروز ہیں جن پر اُس دور کو پورا فخر و ناز ہے اس باکمال مجمع کے چند متبرک نام حسب ذیل ہیں:—

(۱) استاد الاساتذہ حضرت مولانا لطف اللہ علیگڑھیؒ۔

(۲) مولانا حافظ شاہ محمد حسین الہ آبادیؒ۔

(۳) حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ۔

(۴) شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب دیوبندیؒ۔

(۵) حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوریؒ۔

(۶) جناب مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسریؒ۔

(۷) جناب مولانا احمد حسن کانپوریؒ۔

(۸) حضرت مولانا محمد علی صاحب مونگیریؒ۔

(۹) مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلوارویؒ۔

(۱۰) مولانا حکیم سید ظہور الاسلام صاحب فتحپوریؒ۔

(۱۱) مولانا حکیم فخر الحسن صاحب گنگوہیؒ۔

یہ پُرانوار مجلس طلبہ کی دستار بندی کے ساتھ ہی امت وقت کی صورتِ حال سے بے حد مضطرب ہے، ان بزرگوں کے سامنے نقشہ یہ تھا کہ ملک میں انقلاب و حوادث کے طوفان اُٹھ رہے تھے پُرانا سلسلۂ تعلیم ٹوٹ رہا تھا، ہر طرف عیسائیت کا چرچا تھا مشنریوں کے جال ہر جگہ ہر طرف پھیلے ہوئے تھے، یورپ کے نئے خیالات سیلاب کی طرح اُمڈے چلے آرہے تھے، عام علماء زیادہ تر پڑھنے پڑھانے میں مصروف تھے، اور ایک طبقہ چند فروعی مسائل کو مناظروں کی گرم بازاری کا ذریعہ بنائے ہوئے تھا۔ خدا کے گھر لڑائی کے میدان بن گئے تھے، پُرانا طریقۂ درس زمانہ کے انقلاب سے بیکار اور نئے زمانہ کیلئے قوم کے نئے رہبر اور رہنما پیدا کرنے سے قاصر تھا۔ اسلئے اس مبارک جلسہ میں طے پایا کہ باہمی مشورہ سے علماء کی ایک مجلس قائم کی جائے اور آئندہ سال مدرسہ فیض عام کے سالانہ جلسہ کے موقع پر تمام ہندوستان کے علماء کو اس کیلئے عام دعوت دی جائے۔ اس مجلس کا نام ندوۃ العلماء قرار پایا۔

مجلس ندوۃ العلماء نے بعد کے جلسوں میں جو تجویزیں قوم و ملک کے سامنے رکھیں، اور مسلمانوں کی معاشرتی اور تعلیمی اصلاح کا جو پروگرام پیش کیا اُس کی تفصیل انشاء اللہ اس رسالہ کے ذریعہ آئندہ معلوم ہوتی رہے گی۔ چونکہ اس وقت کے حالات سے مسلمانوں کے دل دُکھے ہوئے تھے اور ان کو دینی اعتبار سے اپنا مستقبل تیرہ و تار نظر آرہا تھا، اسلئے انھوں نے مجلس ندوۃ العلماء کی بروقت آواز کا پُرجوش خیر مقدم کیا۔ ان کے اندر زندگی کی ایک لہر دوڑ گئی انھوں نے محسوس کیا کہ ہندوستان میں ہمارے مستقبل کی تعمیر کے لئے ندوۃ العلماء کے اغراض و مقاصد سے تعاون بیحد ضروری ہے۔

مجلس ندوۃ العلماء کے مقاصد کو اگر چند جملوں میں بیان کیا جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ ندوۃ العلماء کا مقصد یہ تھا کہ مختلف مکاتب فکر کے باوجود علماء کو اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کیلئے ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا جائے مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں دینی رنگ بھرا جائے، مدارس دینیہ کا نصابِ تعلیم ایسا رکھا جائے جو وقت کے تقاضوں کو پورا کر سکے۔

مجلس ندوۃ العلماء ان مقاصد میں کہاں تک کامیابی حاصل کر سکی؟ اس پر تو انشاء اللہ اس رسالہ میں آئندہ گفتگو ہوتی رہے گی۔ اس وقت تو صرف یہ عرض کرنا ہے کہ ندوۃ العلماء کی مجلس جن حالات میں قائم ہوئی تھی کیا آج ہم اس سے کہیں زائد سخت اور دشوار گذار وادی تیہ میں حیران و سرگردان نہیں ہیں؟ اُس وقت صرف حکومتوں کے انقلابات کا معاملہ تھا، مگر آج اپنی ملی روایات تختۂ دار پر ہیں۔ اُس وقت مشنریوں کا دامِ تزویر پھیلا ہوا تھا، لیکن آج حق کے مقابلہ میں باطل ہزار فتنہ سامانیوں کیساتھ نبرد آزما ہے، اُس وقت یورپ کے خیالات ایک محدود حلقہ میں اثر انداز ہو رہے تھے، اور آج تو تحقیق و ریسرچ کے نام سے سیاست کی راہ سے، تہذیب و تمدن کے عنوان سے اور معاشیات کے چور دروازہ سے الحاد اور خدا فراموشی گھر گھر اپنا پیغام پہونچا رہی ہے، اُس وقت چند فروعی مسائل بحث و مناظرہ کا سامان بنے ہوئے تھے اور آج یہ خطرہ ہے کہ آئندہ ان فروعی مسائل کے بھی نام لینے والے باقی نہ رہیں گے! کیا ان حالات میں اس کی ضرورت نہیں ہے کہ

(۱) علمائے اسلام کو دعوت دی جائے کہ وہ مختلف مکاتب فکر کے باوجود اسلام کے اساسی مسائل کے تحفظ اور اس کی صحیح اور مناسب تشریح کے لئے، نیز مسلمانوں کی بنیادی ضروریات کے لئے اپنے اندر رابطہ پیدا کریں، تخریب اور گروہ بندی کے عبرتناک نتائج ہمارے سامنے ہیں، اگر یہ حالات بھی ہم کو اشتراکِ عمل پر متوجہ نہ کر سکے تو۔ ع

سعدی ز دستِ خویشتن فریاد

کے مصداق بن جائیں گے۔

(۲) دینی مدارس کو متوجہ کیا جائے کہ زمانہ جس برق رفتاری کے ساتھ آگے جارہا ہے۔ قدیم انسانی مسلمات حرفِ غلط کی طرح مٹ رہے ہیں، انسانی افکار ہر لمحہ بدل رہے ہیں، ان حالات میں اگر ہم نے مدارس دینیہ کے طلبہ کو صرف قدیم مباحث کا پابند رکھا، اور عصری ضرورت سے ان کو بے خبر رکھا تو وہ موجودہ زمانہ میں اسلام کی نمائندگی کا حق ہرگز ادا نہیں کرسکتے، اور اس صورتحال کی پوری ذمہ داری ہمارے سر پر ہوگی، اسلئے ضرورت ہے کہ مدارس دینیہ اپنے نصاب، طرز تعلیم، اور طریقِ تربیت پر پوری نظر ثانی کریں، اور خوفِ ملامت سے بے پروا ہو کر، پختہ عزم اور صحیح فکر کے ساتھ آئندہ نسلوں کا انتظام کریں۔

رسالہ "تعمیر حیات" کے اجراء کا بنیادی مقصد یہی ہے کہ مجلس ندوۃ العلماء کی ان تحریکات اور تجاویز کو زندہ کیا جائے اور اللہ کے نام پر بھروسہ کرکے اپنے مقدور کے مطابق عملی اقدام بھی کیا جائے۔

اللہ تعالیٰ سارکنوں کو توفیق دیں کہ وہ وقت کی اس اہم تحریک کو پورے اخلاص کے ساتھ ملک و ملت کے سامنے پیش کر سکیں، اور اس سلسلہ میں صرف گفتار نہیں کردار کے غازی بنیں۔ ع

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

"جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے"

ایڈیٹر "تعمیرِ حیات" کے نام غرناطہ سے مولانا کا ایک اہم مکتوب

مولانا کا یہ مکتوب جو درج ذیل کیا جا رہا ہے بہت اہمیت کا حامل ہے، اس میں دراصل پورے سفر کا نچوڑ آگیا ہے۔ مولانا اپنے مشاہدہ و مطالعہ سے جس نتیجہ پر پہنچے ہیں وہ انھوں نے اس خط میں بہت صراحت اور وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا ہے، کچھ اہم عملی تجاویز بھی ہیں جو ملت کے ہر دردمند کے لئے لائقِ توجہ اور قابلِ غور ہیں امید ہے کہ مولانا کی آواز صدا بصحرا ثابت نہ ہوگی ——— ایڈیٹر

غرناطہ ۲۳ر اکتوبر ۱۹۶۳ء

عزیز از جان سلمہ اللہ تعالیٰ وحفظہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ امید ہے ہمارا پچھلا رجسٹرڈ خط مل گیا ہوگا، وہ ہم نے گلاسگو جاتے ہوئے لکھا تھا۔ گلاسگو کا سفر حقیقی معنی میں ہوائی اور طائرانہ رہا، صبح ہوائی جہاز سے گئے رات ہوائی جہاز سے واپس آگئے، جمعہ پڑھا، دو خطاب بھی ہوئے، مسلمانوں کی بڑی تعداد ہے دو اور تین ہزار کے درمیان، لیکن بے حد مصروف، جمعہ میں بھی سو سوا سو سے زیادہ نہ تھے، یہ ہفتہ بھر کی مزدوری یا تنخواہ ملنے کا دن ہے اسلئے بعد مغرب بھی بہت کم آسکے، مغربی زندگی کی سب سے بڑی آزمائش یہی مصروفیت اور انہماک ہے۔ مقصود اللہ جنگ صاحب کے دونوں صاحبزادے افتخار اور ممتاز صاحبان ہی میزبان تھے، بڑی محبت اور سعادت کا اظہار کیا، اور عزیزانہ طریقہ پر پیش آئے۔ افتخار صاحب ہی یہاں تبلیغی کام کے روحِ رواں ہیں۔ دونوں بھائی مولوی ابو العرفان صاحب کو بہت یاد کرتے تھے۔ والدہ کی شفقت و خلوص ان لڑکوں میں خوب آیا ہے۔

سنیچر (۲۰/۲۱ اکتوبر) کا دن بڑا مصروف گزرا، کچھ وقت برٹش میوزیم میں، اور کچھ وقت لندن کے مشہور "سیارہ گاہ" PLANETARIUM کی سیر کی، ایک نہایت وسیع گنبد کے اندر آسمان کا نقشہ دکھایا، ستاروں بھرا آسمان اور رات کا سماں تھا۔ اس منظر کے ساتھ ایک علمی تعارفی لکچر جاری تھا۔ ستاروں کا زمین سے بُعد، ان کے آپس کے فاصلے، کروروں ستارے، پھر ان کا زمین سے لاکھوں اور کروروں میل کا فاصلہ، ستاروں کا نظام، روشنی کا سفر، اور ہزاروں برس میں اس کا زمین تک پہونچنا، گویا فلکیات کی ایک کتاب کھلی ہوئی تھی۔ لیکن عبرت اور حیرت کی بات یہ ہے کہ نہ تو تعارف کرانے والے نے اس سے خدا کے وجود اور اس کی قدرتِ کاملہ و حکمتِ بالغہ اور عجز صنعت کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی، اور نہ کہیں خدا کا نام لیا، نہ غالباً حاضرین میں سے (سوائے ان دو گنہگار مسلمانوں کے جن کو نبی امی سے غلامی کی نسبت کا شرف حاصل ہے) کسی کا ذہن اس طرف متوجہ ہوا، لیکن دیدۂ بینا اور گوشِ شنوا کے لئے در و دیوار سے صدا آرہی تھی کہ :- ربنا ما خلقت ھذا باطلا اور صنع اللہ الذی اتقن کل شیء۔ حقیقت یہ ہے کہ یورپ نے کی رسوم و شعار کو سینہ سے لگائے رکھنے کے باوجود علم اور زندگی کا رشتہ مذہب سے توڑ رکھا ہے اسلئے وہ آفاق سے مرکزِ آفاق اور خالقِ آفاق کی طرف منتقل نہیں ہوتا، اور وہاں تفکر فی الخلق کا نتیجہ وہ معرفتِ خالق نہیں جس کا تذکرہ اس آیت ویتفکرون فی خلق السمٰوات والارض ربنا ما خلقت ھذا باطلا میں ہے۔

انگلستان کے ساتھ انگریز اور "فرنگ" کے ساتھ فرنگی کا ذکر بھی ضروری ہے۔ مادیت زندگی کے وحشیانہ تنازع للبقاء، اور خود ساختہ معیاروں و مقاصد کے حصول کی تگ و دو نے لطیف تر احساسات، روحانی تشنگی اور خدا طلبی کے جذبہ کو تقریباً فنا کر دیا ہے، اسی لئے اپنی تمام ذہنی صلاحیتوں، قوتِ ارادی، احساسِ ذمہ داری، نظم و ضبط اور بہت سی خوبیوں کے باوجود وہ صحیح روحانی تحریکوں اور دینی و روحانی فتوحات سے محروم ہے، اور ماہرینِ فن کی یہ سرزمین جس نے دنیا کا نقشہ اور زندگی کا دھارا بدل دیا "عارفین" سے خالی ہے۔ شاید اسی بنا پر مغرب کے رمز شناس اقبال نے کہا تھا۔ ع

یہ وادیٔ ایمن نہیں شایانِ تجلی

اور ان کی فطرتِ سلیم نے کچھ دن ان فرنگی ساحروں کے درمیان رہنے کے بعد اس طرح احتجاج کیا تھا۔ ؎

نشستم با نکویانِ فرنگی ٭ ازاں بے سوز تر روزے ندیدم

رہی سہی فطرت کی سلامتی اور نفسِ لوامہ کی سرزنش "خمر و خنزیر" نے ختم کر دی۔ یہاں چند دن رہ کر ان دونوں "جتناب" کی حرمت کی حکمت جس پر الحمد للہ ایمان بالغیب اور شرح صدر ہمیشہ تھا عین الیقین بن گئی۔ بعض مواقع ایسے پیش آئے کہ اس قوم کی بدمستی اور شراب کی مرد افگنی کا اندازہ ہوا۔ جمعہ اور سنیچر کی درمیانی رات خاص طور پر اس قوم کیلئے (جس کی اسی شب میں مٹھی گرم ہوتی ہے) نائے و نوش اور "بعیش کوش" کی رات ہے، اور اتفاق سے ایک رات کو جب ذرا دیر سے اپنی قیام گاہ پہونچنا ہوا، اور کنجی نہ ہونے کی وجہ سے دیر تک دروازہ کھلنے کا انتظار کرنا پڑا، ان مدعیانِ عقل کی بے عقلی کا خوب منظر دیکھا ہم مسلمان کس کس بات پر اللہ کا شکر کریں، اور کس کس طرح اس نبیٔ امی پر درود و سلام بھیجیں جس نے ان دونوں "ام الخبائث" کو ہمیشہ کے لئے حرام کیا و یحل لھم الطیبات ویحرم علیھم الخبائث۔ یورپ کی موجودہ رندی و آبرو باختگی کی زندگی میں ان دونوں چیزوں کو پھر عورت کی مطلق بے حجابی اور تبرج جاہلیت اور بے قید اختلاط کو بنیادی طور پر دخل ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

اس سب کے باوجود اب بھی اگر یورپ میں کوئی چیز موثر ہو سکتی ہے، اور ان کے مصروف دل و دماغ پر کوئی چیز ضرب لگا سکتی ہے تو وہ صحیح اور طاقتور روحانیت ہے۔ لوگ تعجب کریں گے۔ ہم کو تو یورپ میں اپنے صاحبِ اشراق و اخلاص چشتی مشائخ اور قوی النسبت نقشبندی بزرگ بہت یاد آئے۔ ہمارے نزدیک یہی گروہ اس ملک میں سب سے زیادہ کامیاب ہو سکتا ہے اور انقلاب لا سکتا ہے۔ روشن خیالی اور قوتِ استدلال کا جادو یہاں چلتا نظر نہیں آتا یہاں کے بازار میں اس جنس کی کمی نہیں اور ہم جنس چیز اکثر متوجہ کرنے میں ناکام رہتی ہے، اور اکثر اوقات بے اعتنائی کے نذر ہو جاتی ہے، کہ یہ سرمایہ ہمارے پاس بھی بہت ہے۔ یورپ کا ذہن یا تو قوی و فائق روحانیت سے مات کھاتا ہے یا عمیق و غامض فلسفہ سے، اور تصوف

سلہ قائم مقام مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء

دونوں کا جامع ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ یہاں ہر ایسی چیز کامیاب ہو جاتی ہے جو یورپ کو اپنی زندگی سے مختلف اور اپنی سطح سے گہری نظر آتی ہے۔ اس میں اس کو دھوکے بھی ہوتے ہیں، اور وہ بعض اوقات (اپنی ہی کہاوت کے مطابق) ہر چمکنے والی چیز کو سونا سمجھ لیتا ہے لیکن اس میں شبہ نہیں کہ کھرا اور ٹکسال کا سونا اب بھی مادہ پرست اور باغی یورپ کو خرید سکتا ہے لیکن تصوف خود اپنے مرکز (اسلامی مشرق، اور اپنے آخری مرکز ہندوستان) میں دم توڑ رہا ہے، اور اس کی ضرورت و افادیت کو وہاں عرصہ سے چیلنج کیا جا رہا ہے، اور خود اس سلسلہ میں قوی الاستعداد اور عالی ہمت لوگوں کی عرصہ سے ایسی کمی ہے کہ خود وہاں نصف صدی سے زائد مدت سے مسلسل یہ صدا آرہی ہے کہ

جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے

اس موقع پر مرشدنا حضرت مولانا عبد القادر صاحب رائے پوری قدس اللہ سرہٗ بہت یاد آئے کہ ان کو تصوف (اور شرعی و قرآنی اصطلاح میں تزکیہ و احسان) کے اس فائدہ اور اس پہلو پر بہت یقین تھا، اور ان کو اس کی بڑی تمنا تھی کہ ایسے صاحبِ باطن اور ایسے صاحبِ روحانیت ایسے مرکزوں میں بیٹھ جائیں، اور اپنی حرارتِ باطن اور سوزِ دروں سے خلق اللہ کے قلوب کو روشن اور گرم کریں، مگر لوگوں میں نہ اس کی ہمت نہ فرصت، کسی نے توجہ سے ان کی بات بھی نہ سنی؛ اس وقت انگلستان میں اور سنا ہے کہ امریکہ میں بھی ایک انڈونیشی شخص جن کو ان کے معتقدین پاپا کپ ثبوت کہتے ہیں، اور جو ایک خاص طریقہ پر توجہ دیتے ہیں، اور ان کا طریق تخلیۂ باطن پر قائم ہے، ایک مخصوص حلقہ میں بہت مقبول ہو رہے ہیں۔ جہاں تک ان کے حلقہ نشینوں سے پتہ لگا یا وہ فرائضِ شرعیہ کے پابند نہیں، وحدتِ ادیان کا سا خیال معلوم ہوتا ہے، اگرچہ وہ اپنے کو مسلمان ہی کہتے ہیں لیکن اگر یہاں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ یا حضرت خواجہ باقی باللہؒ کا کوئی قوی النسبت، متبعِ سنت، بلکہ عاشقِ سنت و عاشقِ رسولؐ جانشین پہونچ جائے تو کیا عجب کہ :-

جہانے را دگرگوں کرد یک مردِ خود آگاہے

اور اقبال کا یہ کہنا بھی صحیح ہو جائے کہ :- ع

"پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانہ سے"

باقی یہاں ان اسلامک مشن وغیرہ کا نہ کچھ کام دیکھا نہ ذکر سنا جن کا برسوں سے غلغلہ بلند ہے، اور دھوم مچی ہوئی ہے کہ یورپ عنقریب فتح ہونے والا ہے۔ یونیورسٹی اور کالجوں کے اساتذہ اور ذہین طلبہ کا طبقہ اچھے طاقتور اسلامی لٹریچر کا بے شک محتاج ہے، بشرطیکہ مناسب عمدہ زبان میں ہو، اور اس میں مرعوبیت اور معذرت و تاویل کا وہ انداز نہ ہو جو تقریباً اس صدی کی ابتداء سے انگریزی میں اسلامیات کے مصنفین کا شعار رہا ہے۔ افسوس ہے کہ ابھی تک سیرت پر بھی کوئی طاقتور اور موثر کتاب نہیں ملتی معلوم ہے ہمارے انگریزی خواں مسلمان (جن پر پوری ایک صدی گزر چکی ہے) اپنی صلاحیت کہاں صرف کرتے ہیں، اور یہ میدان ایک صدی سے کیوں خالی چلا آرہا ہے۔ ؎

گوئے توفیق و سعادت درمیاں افگندہ اند
کس بمیداں در نمی آید سواراں را چہ شد

جہاں تک مسلمان طلبہ اور نوجوانوں کا تعلق ہے جو یہاں لاکھوں کی تعداد میں انگلستان فرانس، جرمنی اور اسپین میں زیرِ تعلیم ہیں۔ ان کی اصلاح و تربیت اور ان کی اسلامیت کی حفاظت کے لئے سب سے بہتر نسخہ وہ ہے جو ہندوستان کے لئے مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے تجویز کیا تھا، اور اب ہمارے مولانا عبد الباری صاحب ندوی اسکے علمبردار اور داعی ہیں یعنی طلبہ کیلئے اقامت خانوں کی تاسیس اور ان میں اچھے نگراں و مربی کا انتظام، یہاں ہوسٹلز اور طلبہ کے قیام کا مسئلہ بڑا اہم مسئلہ ہے۔ عام طور پر طلبہ فلیٹ لیکر یا گھروں میں (لینڈ لیڈی کے مکانات میں) رہتے ہیں۔ ان کی تربیت اور ان کے اندر اسلامی شعور کے بیدار کرنے کا ذکر کیا، جو اسلامیت وہ اپنے گھروں سے لیکر آتے ہیں اس کو محفوظ رکھنے کا بھی کوئی سامان نہیں۔ ساری فضا سارا ماحول (صدق کی پرمعنی اصطلاح میں) یاجوجی اور دجالی ہے۔ ایسی حالت میں اگر ایسے ہوسٹل اور بورڈنگ ہاؤس قائم کئے جائیں یا وسیع مکانات کرایہ پر لیکر یا ان کو خرید کر اس مقصد کے لئے وقف کیا جائے اور ان میں ۱۵، ۱۵ - ۲۰، ۲۰ طالب علم یا کم و بیش رکھے جائیں، اور کوئی کام کا آدمی جوان پر اثر انداز ہو سکے وہاں قیام کرے تو نہ صرف یہ کہ یہ نوجوان (جو ہمارا تجربہ یہ ہے کہ ہندوستان و پاکستان سے زیادہ یہاں دین کی بات قبول کرنے کی صلاحیت اور اس کی طلب رکھتے ہیں) یاجوج کی دستبرد سے بچ جائیں گے بلکہ امید ہے مسلم ممالک کو بہتر قیادت اور حکومتیں نصیب ہوں گی جو عرصۂ دراز سے فرنگ کے مسخ شدہ عناصر کے ہاتھ میں بازیچۂ اطفال بنی ہوئی ہیں، اور سادہ دل و گرم جوش مسلمان عوام بھیڑ بکریوں کے ریوڑ کی طرح ان کی لاٹھی کے پیچھے ہیں۔ یہی نوجوان ہیں (جو اپنی صحیح صلاحیت اور فنی مہارت کی وجہ سے ان ملکوں کی زمامِ کار سنبھالیں گے) ان کو سنبھالنے کی جگہ ہندوستان و پاکستان، مصر و شام اور ترکی نہیں جہاں وہ پختہ اور مغربی تہذیب کے پرجوش داعی بن کر پہونچیں گے، بلکہ یہ کارگاہیں ہیں جہاں ان کو پگھلا کر سانچہ میں ڈھالا جاتا ہے، یہاں مکانات خریدنے (خصوصاً دولتِ مشترکہ کے ملک میں رہنے والوں کے لئے) کی بہت آسانیاں ہیں، اس کوشش کا فوری نتیجہ نہیں نکلے گا لیکن نتیجہ بڑا انقلاب انگیز ہے ممکن ہے اس سے نصف صدی کے اندر ہمارے مسلم ممالک کی قیادت میں انقلاب ہو جائے اور ان کا رخ غیر شعوری طریقے پر اور بغیر کسی سیاسی کشمکش کے شر سے خیر، فرنگیتِ کامل سے اسلامِ کامل کی طرف تبدیل ہو جائے، لیکن اس کے لئے ہمارے صاحبِ استطاعت اہلِ خیر اور سرمایہ داروں کی ضرورت ہے۔ مسلمان طلبہ جوق در جوق ایسے اقامت خانوں کا استقبال کریں گے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جو صاحب یہ قدم اٹھائیں وہ خفیف مالی منفعت بھی حاصل کریں لیکن صحیح اسلامی فضا اور مناسب آدمی کی یافت اس پورے منصوبہ کی کنجی اور اس کی کامیابی کی شرط ہے۔ اس توقع پر کہ شاید یہاں کا یہ تاثر و تجربہ کچھ لوگوں کو متوجہ کرے اور اس اندیشہ سے کہ یہ بات کہیں ذہن سے نکل نہ جائے اس کو تحریر میں لے آیا گیا۔ وفی ذلک فلیتنافس المتنافسون۔

آج اسی تحریر پر اس خط کو ختم کرتے ہیں MADRID (مجریط) - TOLADO (طلیطلہ) GARANADA (غرناطہ مرحوم) کی داستان طویل بھی ہے اور دل خراش بھی۔ ؎

کبھی فرصت سے سن لینا بڑی ہے داستاں میری

غرناطہ - ہوٹل سوڈان
۲۳ر اکتوبر ۱۹۶۳ء

"ابوالحسن علی"

(ص ۲ کا بقیہ) اصل محرک ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ رسالہ مخدومی مولانا اویس صاحب ندوی (شیخ التفسیر دار العلوم) کی ہمت افزائی و رہنمائی، اور مولانا معین اللہ صاحب ندوی (ناظر شعبہ تعمیر و ترقی) کے جذبہ اور اصرار کا نتیجہ ہے۔ اگر ان دونوں حضرات کی ہمت افزائی اور اصرار نہ ہوتا تو میرے لئے اس بوجھ کو اٹھانا مشکل تھا۔ مخدومی مولانا محمد اسحٰق صاحب ندوی (استاذ حدیث دار العلوم) کے قیمتی مشورے بھی میرے لئے مشعلِ راہ ہوں گے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ سب حضرات کی کوششوں کو قبول فرمائے، اور اس رسالہ کو مفید اور مقبول بنائے۔

ضروری عبارات: ——— ہمیں افسوس ہے کہ اس شمارہ میں متعدد مستقل عنوانات مثلاً: "تھوڑی دیر اہلِ حق کے ساتھ"، "فقہی مسائل"، "دلچسپ معلومات"، "نئی کتابیں"، "حفظانِ صحت" اور بعض ضروری مضامین شامل نہیں ہو سکے جو انشاءاللہ دوسری اشاعت میں پیش کئے جائیں گے ——— ایڈیٹر

فرانس کو اس سے زیادہ ترقی یافتہ، منظم اور خوبصورت پایا جتنا سمجھتے تھے مگر اس سے زیادہ تاریک اور بے روح پایا جتنا تصور تھا

یورپ میں عورت انتہائی مظلوم ہے اور ہر جگہ دھکے کھاتی پھرتی ہے، نسوانیت، حیا اور کشش اس سے بالکل مفقود ہو چکی ہے

موجودہ ادب، تصویر اور فلم سازی اسی کشش اور دلاویزی کو مصنوعی طور پر پیدا کرنے کی ناکام کوشش ہے

:مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے دورۂ یورپ کے مشاہدات اور تاثرات:

سفر کی کہانی اس سفر کی داستان تشنہ رہے گی جب تک کہ ڈاکٹر سعید رمضان اور اسلامک سنٹر کا ذکر نہ کیا جائے۔ اسلامک سنٹر یورپ کی مشہور سیرگاہ، سیاسی پناہ گاہ اور بین الاقوامی شہر جنیوا میں چند سال ہوئے قائم ہوا ہے، اس کے تعارف کے لیے ڈاکٹر سعید رمضان کا نام ہی کافی ہے جو ہماری آپ کی جانی پہچانی شخصیت ہیں۔

صرف مغربی جرمنی میں ۱۵ ہزار طالب علم اسلامک سنٹر جس عظیم مہم کو سر کرنے کے لیے قائم ہوا ہے اس کا ایک ہلکا سا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ یورپ کے دوسرے ممالک اور ممالک متحدہ امریکہ و کناڈا سب کو چھوڑ کر صرف مغربی جرمنی میں جو مسلم نوجوان اعلیٰ تعلیم کے لیے مقیم ہیں ان کی تعداد پندرہ ہزار ہے ان سب سے رابطہ قائم کرنا، ان کی دینی نگرانی و تربیت، ان کی فکری و روحانی غذا کا انتظام، ماحول کے جراثیم سے ان کی امکانی حد تک حفاظت یہ ہے مقصد اسلامک سنٹر کا۔ فلاح جو لڑکے فنی تعلیم کے لیے وہاں مقیم ہیں، بلا شبہ کل وہ ہمارے اسلامک ممالک کے سربراہ ہوں گے، اگر انکی طاقتور موثر اور صحیح دینی تربیت و غذا کا انتظام ہو تو شاید یہ ایسا شارٹ کٹ SHORT CUT ہو جو منزل مقصود کو اچانک بہت قریب کر دے۔ یہی خواب اور امید کی ایک ہلکی سی کرن اسلامک سنٹر کی اصل محرک ہے

جنیوا میں: گذشتہ سال سے اسلامک سنٹر کے ذمہ داروں کا شدید تقاضہ اور اصرار تھا کہ مولانا جنیوا تشریف لائیں اس کے جنیوا جوڑ کے ایک جلسے میں شرکت کے لیے مولانا ۲۸ ستمبر کو وہاں پہونچ گئے۔ انگلستان، جرمنی اور فرانس کے بہت سے طالب علم مولانا کے منتظر تھے اور ایک نشست میں انھوں نے دل کھول کر مولانا سے سوالات کیے ڈاکٹر حمید اللہ پروفیسر اسلامیات پیرس یونیورسٹی اور مولانا ظفر احمد انصاری اور دوسرے حضرات سے مولانا کی مفصل ملاقاتیں اور تبادلۂ خیال ہوا۔ مولانا کو وہاں کے مسلم نوجوانوں میں جو بات نظر آئی اسکا ذکر انھوں نے اپنے خطوط میں بار ہا کیا ہے۔ جنیوا سے ایک موقع پر لکھتے ہیں:۔ "ہمارے یہاں کے دیندار نوجوان صورت سیرت میں مکمل ہیں

فائق ہوں مگر ان کی سی گرم جوشی، زندہ دلی اور وسعت قلب نہیں"۔

جنیوا میں مولانا کی ملاقات مشرق وسطیٰ کے دوستوں کی انجمن کے صدر (ERIC BERTH) سے ہوئی اور دیر تک تبادلۂ خیال رہا۔

ڈاکٹر حمید اللہ کا تعارف:۔ ڈاکٹر حمید اللہ کے متعلق مولانا لکھتے ہیں "عجب درویش، مجاہد، سپاہی اور فنا فی العلم آدمی ہیں۔ اپنی بہت سی خصوصیات میں نادرہ عصر اور بے نظیر آدمی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اسی کام کے لیے فرانس بھیجا ہے خود انکا بھی یہی عقیدہ ہے (اس موقع پر یہ ذکر کر دینا ضروری ہے کہ ڈاکٹر صاحب پیرس میں مستقل مقیم ہیں اور انھوں نے فرانسیسی میں قرآن کا ترجمہ کیا ہے) عجب زاہدانہ بلکہ فقیرانہ زندگی ہے۔ ۱۵-۱۶ برس سے گوشت (مشتبہ ہونے کی وجہ سے) اور مچھلی انڈا تجرد کی بنا پر بالکل ترک کر رکھا ہے۔

جنیوا کا حسن طبعی:۔ مولانا جنیوا کے بعض قصبات و دیہات میں بھی گئے اور اس کے طبعی مناظر سے لطف اندوز ہوئے، لکھتے ہیں:۔ "شام کو سیر کا پروگرام تھا۔ قدرتی حسن اور انسانی ذوق و تنظیم کا بڑا دلکش مجموعہ ہے متعدد دیہاتوں سے گذرنا ہوا، دیہات کیا ہے معلوم ہوتا تھا کہ حضرت گنج[1] کا ایک محلہ ہے اور صفائی میں بڑھے ہوئے۔

جنیوا سے پیرس:۔ اب جنیوا کو چھوڑ کر پیرس کی طرف آئیے۔ پیرس حسن و جمال علم و ادب اور ذوق و لطافت میں اپنی نظیر سمجھا جاتا رہا ہے۔ مولانا نے پیرس کی مادی ترقی بھی دیکھی اور اس کی روحانی تیرگی بھی، اس کی جگمگاتی روشنی اور اس کے گھٹا ٹوپ اندھیرے دونوں ان کے سامنے تھے۔

روشن اندھیرا:۔ اگرچہ یہ روشنی اتنی تیز ہوتی ہے کہ بسا اوقات نگاہیں اسی میں خیرہ ہو کر رہ جاتی ہیں اور ان تہوں تک نہیں پہونچ سکتیں۔ جہاں ظلمتوں کا ڈیرہ ہے یہ دراصل ایک "روشن اندھیرا" ہے جس نے یورپ کی کریہہ صورت پر ایک حسین نقاب ڈال رکھی ہے۔

[1] حضرت گنج لکھنؤ کا سب سے ترقی یافتہ علاقہ ہے

پیرس کے پہلے ہی خط میں جو مولانا نے ایڈیٹر تعمیر حیات کو لکھا ان دونوں پہلوؤں کا ذکر موجود ہے اور پوری بے تکلفی اور صفائی کے ساتھ "پیرس کو اس سے زیادہ ترقی یافتہ، منظم اور خوبصورت پایا جتنا تھا یا جتنا سمجھتے تھے مگر اس سے زیادہ تاریک بے روح اور اسلام کے اثرات سے باوجود پانچ لاکھ عرب مسلمانوں کے شہر میں موجود ہونے کے محروم اور خالی پایا جتنا سمجھتے تھے"۔ اسی خط میں آگے لکھتے ہیں "مشرق میں ایک بزرگ سے ملاقات ہوئی تھی اور ہمارا سارا لٹریچر ان کے تذکروں سے بھرا ہوا یہاں کہیں ان کا نام و نشان نہیں۔ ہماری مراد حضرت دل سے ہے یہاں اس نام اور ان صفات کی کوئی ہستی پائی نہیں جاتی لیکن عیبہا جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو' یورپ میں بعض برائیوں کے ساتھ اچھائیاں بھی ہیں۔ اس کی علم دوستی اور علم پرستی کا بڑا حصہ اگرچہ علم غیر نافع "کے حکم میں آتا ہے لیکن

پھر بھی اس میں سنجیدگی، وقار و عظمت کا پہلو ضرور پایا جاتا ہے"، ۹۸۶ فٹ بلند [illegible] دیکھنے کے بعد مولانا وہاں کا قومی کتب خانہ بھی دیکھنے گئے [illegible] مولانا کے الفاظ ہیں۔

روزانہ ایک ملین کتابیں:۔ اس میں سات ملین (ستر لاکھ) منتخب کتابیں ہیں، صرف چار ہزار رسالے جاری ہیں۔ کہتے ہیں کہ روزانہ ایک درجن کتابیں آتی ہیں۔

پیرس کا شالامار مولانا لکھتے ہیں' پیرس کا باغ حقیقتاً عظیم الشان باغ ہے۔ ڈاکٹر حمید اللہ کی ایک فرانسیسی مستند حوالہ کی بنا پر تحقیق ہے کہ یہ عہد جہانگیری کے شالامار باغ کی نقل ہے [illegible] دیکھنے سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے اس لیے کہ اس میں [illegible] ترتیب ہے جو لاہور اور سرینگر کے شالامار باغ میں ہم نے دیکھی تھی۔ پیرس ہی کے خط میں مولانا نے حسب ذیل تاثرات لکھے ہیں جو آج تہذیب مغرب کے دلدادہ اور مادی ترقیات پر فریفتہ تمام انسانوں کے لئے عبرت و موعظت ہیں، بالخصوص اس فریب کا پردہ چاک ہوتا ہے جس میں عالم اسلام کے تمام تجدد پسند مبتلا ہیں۔

عورت کی مظلومیت:۔ "یورپ میں عورت کو جو مقام و احترام حاصل ہے اس کا طلسم بھی خوب ٹوٹا، بیچاری بھاڑے کی ٹٹو بن گئی ہیں، دکاندار وہ ہے، قلی وہ ہے، ادنیٰ ادنیٰ اسامیوں پر معمور، ریل، میٹرو، بسوں، سب جگہ دھکے کھاتی پھرتی ہے، مرد آرام سے بیٹھا ہوتا ہے اور عورت کھڑی — نسوانیت و حیا و کشش اس سے بالکل مفقود ہو چکی ہے۔ اس سے موجودہ ادب، تصویر، فلم سازی اور افسانوں کے موجودہ رجحان اور افزوں عریانی کی وجہ سمجھ میں آئی، کہ عورت میں کوئی دل آویزی اور کشش باقی نہیں رہتی اس لیے اس کو ان ذرائع سے پیدا کرتے ہیں اور مردوں کے احساسات کو بیدار کرنے کی کوشش کرتے ہیں"۔

آذر کدہ میں اعلان حق:۔ لندن کے قیام کی ایک خاص بات لندن یونیورسٹی ہال میں مولانا کی تقریر تھی، یہ شاید پہلا موقع تھا کہ کسی عالم اور داعی نے اتنی صراحت کے ساتھ بات کہی ہو اور دکھتی ہوئی رگ پر انگلی رکھی ہو۔ "هذا السعادة والسلام یا اهل الغرب" کے نام سے عربی میں تقریر کی اور مصطفیٰ نامی ایک جوشیلے نومسلم نوجوان نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا، بی بی سی نے بھی مولانا سے انٹرویو لیا اور ایک تقریر "انگلستان کے تاثرات" ریکارڈ کی۔

اجتماعات اور شخصی ملاقاتوں کے علاوہ مولانا نے کیمبرج، آکسفورڈ بھی دیکھا۔ مولانا محمد علی کے ہوسٹل میں بھی گئے جہاں زمانہ تعلیم میں ان کا قیام تھا۔ گلاسکو کا بھی ایک طائرانہ سفر کیا، وہاں دو تقریریں ہوئیں گلاسکو میں مسلمانوں کی تعداد دو تین ہزار کے درمیان ہے۔

غرناطہ سے:۔ اور لندن چھوڑنے کے بعد غرناطہ سے جو خط مولانا نے لکھا وہ دراصل اس سارے سفر کا نچوڑ اور مولانا کے سارے مشاہدات اور تاثرات کا خلاصہ اور نتیجہ ہے اور اس شمارہ میں شامل ہے۔

آخری اطلاع کے مطابق مولانا ۶ نومبر کو جنیوا چھوڑنے والے ہیں اور ۱۰ نومبر کو لکھنؤ پہونچنے کا پروگرام ہے۔

[1] تقریر کا ترجمہ ندائے ملت میں شائع ہو چکا ہے

کون رہ بتلا سکے جب خضر بہکانے لگے

آج سے چند سال پہلے یہ کون تصور کر سکتا تھا کہ عالم عربی کے مرکز مصر اور عالم اسلام کی سب سے بڑی یونیورسٹی جامع ازہر کے ترجمان مجلۃ الازہر کے افتتاحیہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقابلہ صلاح الدین ایوبی سے بلکہ خاکم بدہن جمال عبدالناصر سے کیا جائیگا اور ناصری انقلاب کو رسول اللہ علیہ وسلم کے انقلاب پر ترجیح دی جائے گی۔ کم از کم اتنا اندازہ تو نہ تھا کہ رسالے کے چیف ایڈیٹر احمد حسن الزیات جن کے قلم نے برسوں مشہور ادبی رسالہ الرسالۃ کے صفحات پر اسلام کی ترجمانی اور وکالت پر گوہر افشانی کی، عمر کے اس مرحلہ میں جب ہر مسلمان کو کسی نہ کسی درجہ میں آخرت کی طرف توجہ ہونے لگتی ہے اپنی بدقسمتی کے محضر پر خود اپنے ہاتھوں سے دستخط کریں گے اور لاکھوں مسلمانوں کو اس کا گواہ بنائیں گے۔

لیکن افسوس کہ معاملہ ایک فرد تک محدود نہ رہا۔ اس بے عقلی اور بے شرمی کے خلاف مصر کے جلیل القدر علماء و مشائخ اور واعظین میں سے کسی حلقہ کی طرف سے کوئی صدائے احتجاج بلند نہ ہوئی بے نے کے اگر کسی نے کچھ لکھا تو وہ قاہرہ کا ایک کمزور دینی ماہنامہ الاعتصام تھا جس کی آواز شاید اس کے دفتر سے باہر نہ گئی ہو، اسکے بعد [illegible] کے مطابق سعید رمضان کے پرچہ "المسلمون" اور مصطفیٰ السباعی کے پرچہ "حضارۃ الاسلام" نے اس تلخ نوائی اور ناشاعری کا فرض انجام دیا جو تمام مسلمانوں پر بالخصوص اسلامی صحافت پر عائد ہوتا ہے۔ چوتھا نمبر شاید البعث الاسلامی کا تھا۔ ان [illegible] کو چھوڑ کر عالم عربی میں غالباً کسی نے باقاعدہ اس پر صدائے احتجاج بلند نہ کی گیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (فداہ ابی و امی) کی غلامی اور وفاداری کا جذبہ ان ممالک میں اتنا سرد پڑ چکا ہے کہ مصر سے اتنی دور رہ کر بھی وہ اپنی بے چینی اور ناگواری اور غم و غصہ کا اظہار نہیں کر سکتے۔ یہ بے حمیتی اور بے غیرتی کی آخری منزل نہیں تو اور کیا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ خوشامد، بے عقلی اور بے ضمیری کی وہ عجیب و غریب ادا جو مقالہ نگار نے ایجاد کی ہے اور لوگوں کو بھی پسند آئی ہو، آخر کیا معاملہ ہے؟ — شاعر نے تو کہا تھا — اندکے پیش تو گفتم غم دل ترسیدم کہ دل آزردہ شوی ورنہ سخن بسیار است لیکن شاید اس "جمالی دور" میں کوئی آزردہ ہونے والا بھی نہیں رہا — انما اشکو بثی وحزنی الی اللہ

آج کا دار العلوم

• ندوہ کے فضلاء لندن سے پی۔ ایچ۔ ڈی کر سکتے ہیں

لندن سے آنے والی موثوق اطلاعات سے معلوم ہوا ہے کہ لندن اور اڈنبرا یونیورسٹی نے دارالعلوم ندوۃ العلماء کی سند فضیلت کو تسلیم کر لیا ہے اب یہاں کے فضلاء ان یونیورسٹیوں میں براہ راست پی۔ ایچ۔ ڈی کر سکیں گے۔ اس فیصلہ پر عمل درآمد بھی شروع ہو گیا چنانچہ ندوہ کے ایک فاضل مولانا عبداللہ عباس ندوی لندن یونیورسٹی سے "ابن کثیر" پر ڈاکٹریٹ کر رہے ہیں۔

• نصاب کمیٹی کی اہم نشست

دارالعلوم ندوۃ العلماء کی نصابی کمیٹی کی دو اہم نشستیں ۱۹ اور ۲۰ اکتوبر کو ہوئیں۔ کمیٹی نے کافی غور و خوض کے بعد ابتدائی اور اعدادی درجات کی تعلیم کے لیے ۸ سالہ کورس کا ایک خاکہ مرتب کیا اور اس خاکے کے متعلق ابتدائی تعلیم کے متعدد اسلامی الفکر ماہرین کے پاس ان کی رائے معلوم کرنے کے لیے بھیجا ہے جن کے مشوروں کے بعد اسکو آخری شکل دے دی جائے گی۔

ان سفارشات کی ایک خاص بات یہ ہے کہ انگریزی کا آغاز پانچویں درجے کرنے کی سفارش کی گئی ہے اس کے علاوہ ہندی، جغرافیہ، تاریخ، تمدن اور معلومات عامہ کو بھی ابتدائی نصاب میں شامل کیا گیا ہے۔ فارسی بھی شامل نصاب ہے، متوسط اور اعلیٰ تعلیم کے لیے نصاب پر غور کرنے کے لیے کمیٹی کی مزید نشستیں ہوں گی۔ امید کی جاتی ہے کہ اس ماہ کے ختم تک متوسط درجات کی تعلیم کے لیے سفارشات مرتب ہو سکیں گی۔

نصاب کے سلسلے میں مولانا ابوالحسن علی صاحب ندوی کی اہم تقریر جو انھوں نے جلسہ انتظامیہ منعقدہ یکم ستمبر ۶۳ء میں کی تھی آئندہ شمارہ میں ملاحظہ فرمائیں

• دارالعلوم ندوۃ العلماء میں عظیم الشان تبلیغی اجتماع:۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ۹، ۱۰، ۱۱، نومبر کو تبلیغی اجتماعات کا ایک عظیم الشان اجلاس ہونے والا ہے۔ خیال ہے کہ صرف باہر سے آنیوالوں کی تعداد (جس میں گجرات، بمبئی اور ملک کے بیشتر حصوں کی جماعتیں شامل ہیں) کئی ہزار ہوگی۔ امید ہے کہ ۲۵-۳۰ ہزار افراد جلسہ میں شریک ہو سکیں گے دوسرے ممالک سے آنیوالی جماعتوں میں انگلینڈ، شام اور دوسرے ممالک کی جماعتیں قابل ذکر ہیں۔

"ایسی چنگاری بھی یارب اپنے خاکستر میں تھی"

مولانا سید "محمد علی مونگیری" بانیٔ ندوۃ العلماء

"یہ سلسلۂ مضامین ہمارے اُن اکابر کے ذکر کے لئے وقف ہے جنھوں نے ندوۃ العلماء کی اپنے خونِ جگر سے آبیاری کی، اور اس عزیز اور بلند مقصد کیلئے اپنی بہترین توجہات اور صلاحیتیں وقف کردیں، جنھوں نے انتہائی نازک اور دشوار حالات میں بھی اسکے علم کو بلند رکھا، جن کی خاموش کوششوں اور قربانیوں جن کے اخلاص و بے غرضی جن کی بلند نظری، وقت شناسی اور حوصلہ مندی کا ندوۃ العلماء رہینِ منت ہے۔ اس سلسلہ کا آغاز ہم مولانا سید محمد علی مونگیریؒ سے کررہے ہیں جو اسکے بانی اور ناظم اوّل تھے ——— (ایڈیٹر)

مولانا سید محمد علی مونگیریؒ کی ولادت ۱۲۶۳ھ م ۱۸۴۶ء میں کانپور میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم کے بعد مدرسہ فیضِ عام کانپور میں داخل ہوئے، اور مفتی عنایت احمد کاکوروی اور دوسرے مشہور اساتذہ سے تعلیم حاصل کی۔ درسیات کی تکمیل مولانا لطف اللہ صاحب علیگڑھی سے کی۔ آغاز جوانی ہی میں مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ کا دامن اس طرح پکڑا کہ آخر وقت تک نہ چھوڑا۔

اپنے زمانہ کے نامور محدث مولانا احمد علی سہارنپوریؒ کی خدمت میں گیارہ مہینے رہ کر حدیث کی تکمیل کی، اور اسکے بعد عرصہ تک کانپور میں تدریسی خدمت انجام دیتے رہے۔ اسی زمانہ میں مولانا نے بہت سے دوستوں کی مخالفت اور بے ہمت شکنی کے باوجود "انجمن تہذیب" قائم کی، اور اس انجمن کی بدولت علماء اور جدید طبقہ کے افراد ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوئے۔ اس وقت مولانا کی عمر تقریباً ۲۵، ۲۶ سال کی تھی۔

۱۳۰۹ھ میں اور اسکے بعد کے سالوں میں عیسائیت نے سر اُٹھایا، مولانا اس فتنہ کے ستباب کے لئے فوراً میدانِ عمل میں آگئے، اسکے رد میں متعدد کتابیں تصنیف کیں۔ ایک اخبار "منشورِ محمدی" بھی جاری کیا، یتیم اور غریب بچوں کے لئے جن کو عیسائی مشنریاں اپنے اسکولوں میں داخل کررہی تھیں کانپور میں ایک یتیم خانہ قائم کیا، اور اس یتیم خانہ نے بڑی خدمت انجام دی۔ مولانا کی ان کتابوں میں جو رد عیسائیت میں لکھی گئیں :———

"آئینۂ اسلام" اور "ترانۂ حجازی"

ممتاز درجہ رکھتی ہیں لیکن ان کی سب سے معرکۃ الآراء کتاب

"پیغامِ محمدی" ہے

جو دو جلدوں میں ہے۔ اس کتاب کا جواب کوئی پادری نہ دے سکا۔ انگریزی کے علاوہ اس کتاب کا بعض ہندوستانی زبانوں میں بھی ترجمہ ہوا۔

سنہ ۱۳۱۰ھ میں مدرسہ فیضِ عام کانپور کے جلسۂ دستاربندی کے موقع پر علماء کی ایک تاریخی مجلس مشاورت میں جس میں ہندوستان کے ممتاز علماء شریک تھے۔ ندوۃ العلماء کا قیام عمل میں آیا، اور اس بارِ گراں کو اٹھانے کے لئے قرعۂ فال مولانا ہی کے نام پڑا، اور وہ اسکے پہلے ناظم منتخب ہوئے۔

سنہ ۱۳۱۱ھ میں ندوۃ العلماء کا عام اجلاس ہوا، اور اس سے پورے ملک میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی، اور لوگوں نے یہ محسوس کیا کہ۔ ع

"بجلیاں بَرسے ہوئے بادل میں بھی خوابیدہ ہیں"

اس وقت مولانا نے ایک نقشۂ مضامین شائع کیا، اور اسکے ذریعہ لوگوں کو نئے طرز سے سوچنے کی دعوت دی۔

اس جلسہ میں جو لوگ ان کے طرزِ فکر سے مانوس ہوئے اُن میں مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی پیش پیش تھے۔ مولانا شروانی کی بعض تصنیفات (جیسا کہ ایک موقع پر انھوں نے خود اعتراف کیا ہے) اسی فکری رہنمائی کا نتیجہ ہیں۔

اجلاس لکھنؤ میں مولانا نے فقہ میں اجتہاد اور وسیع النظری کی ضرورت پر زور دیا، اور دارالافتاء کے قیام کی تجویز پیش کی اور کچھ عرصہ کے بعد اس کا قیام عمل میں آیا۔

سنہ ۱۳۱۲ھ میں مولانا نے ندوۃ العلماء کے ماتحت ایک دارالعلوم کی تجویز پیش کی، اور یہ تجویز مجلس انتظامی نے منظور کی، اسکے بعد مولانا نے دارالعلوم کا مکمل نقشہ اور دستور العمل پیش کیا جس کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا کی نظر اس شعبہ میں کتنی گہری، کتنی وسیع اور کیسی جدید (UP-TO-DATE) تھی۔ مسودۂ دارالعلوم کے چند ماہ بعد مولانا نے پہلا مجوزہ نصابِ تعلیم پیش کیا، یہ ندوۃ العلماء کا گویا پہلا "مینی فیسٹو" تھا جس میں اس کا طرزِ فکر، بنیادی مقاصد بہت نمایاں ہو کر سامنے آگئے اور قدیم نصابِ تعلیم کے بہت سے اصولوں اور روایات کو توڑ دیا گیا۔

اسی سال مولانا کی قیادت میں ایک وفد بعض شہروں کیلئے روانہ ہوا، اور اس دورہ کے بہت مفید نتائج برآمد ہوئے۔

اسی زمانہ میں مولانا کے لئے حیدرآباد سے وظیفہ مقرر ہوا، لیکن مولانا نے اس کو ندوہ ہی کے نام منتقل کردیا۔ اسی عرصہ میں مولانا نے دہلی اور غازی پور کا ایک سفر کیا، اور دونوں جگہ "معین الندوہ" کے نام سے "ندوۃ العلماء" کی شاخوں کا قیام عمل میں آیا۔

سنہ ۱۳۱۵ھ بمطابق ۱۸۹۷ء میں مولانا ایک وفد لیکر کانپور سے لکھنؤ روانہ ہوئے اور لکھنؤ میں دارالعلوم قائم ہوا۔

سنہ ۱۳۱۸ھ میں مولانا پہلے سفرِ حج کیلئے تشریف لے گئے۔ چاٹگام میں رجوعِ عام ہوا، اور سیکڑوں ہزاروں طالبین مستفید ہوئے۔ حجاز میں نائب سلطان عبد الرحمٰن پاشا نے حدِ عقیدت و محبت سے پیش آئے اور استنبول کی دعوت دی، لیکن مولانا نے منظور نہ فرمایا۔ مولانا کے اثر و رسوخ اور مقبولیت کو دیکھ کر امیر مکہ نے مولانا سے ریلوے لائن کی تعمیر کے لئے مالی امداد کی درخواست کی، اور ان کو بہت بلند کلمات سے یاد کیا۔

سنہ ۱۳۲۱ھ میں مولانا نے ندوۃ العلماء کی نظامت سے استعفا دیا، اور مونگیر میں مستقل سکونت اختیار کی۔ اس زمانہ میں قادیانیت عروج پر تھی، اور بہار اس کی خاص زد میں تھا، اسکے مقابلہ کی سعادت بھی مولانا ہی کے حصہ میں آئی۔ مولانا سب کام چھوڑ کر اس کے لئے وقف ہوگئے، اور نہ صرف بہار بلکہ ہندوستان کے اور صوبوں میں بھی اس کا تعاقب کیا۔

سنہ ۱۹۱۱ء میں قادیانیوں سے مشہور تاریخی مناظرہ ہوا جس سے قادیانیوں کے حوصلے بہت پست ہوگئے۔ مناظرہ شروع ہوتے ہی مولانا سجدہ میں گر گئے اور جب تک فتح کی خبر نہ آئی سر نہ اٹھایا۔ قادیانیت میں اگر مولانا کی عظیم خدمات نہ ہوتیں تو اس کا اندیشہ تھا کہ پورا صوبہ قادیانی ہوجاتا۔ مونگیر میں سکونت اختیار کرنے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی۔ قادیانیت کے رد میں چھوٹی بڑی کتابیں ملاکر مولانا کی تقریباً ایک سو بیس کتابیں ہیں لیکن ان کی سب سے مشہور اور ممتاز کتاب "فیصلۂ آسمانی" ہے۔

"اِک خیال آگیا اور آنسو رواں"

نذرِ عقیدت و محبّت بحضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم

——— مولانا محمد ثانی حسنی مدیر "رضوان" لکھنؤ

وہ رسالت مآب و شہ دوجہاں   پاک نام آپ کا لے یہ گندی زباں
بے مجال اس کی کیا اور جرأت کہاں   اک خیال آگیا اور آنسو رواں
سیّد ولد آدم وہ خیر الانام
اس پہ لاکھوں درود اس پہ لاکھوں سلام

کیا وہ جوہر فرد پیدا ہوا   سارے عالم میں پھیلی ہے اس کی ضیا
گنگنانے لگے ہیں یہ ارض و سما   آگیا جانِ کون و مکان آگیا
یک زباں کہہ اٹھے رات دن صبح و شام
اس پہ لاکھوں درود اس پہ لاکھوں سلام

آمنہ کا پیارا وہ دُرِّ یتیم   بے کسوں کا سہارا وہ لطفِ عمیم
سب کی آنکھوں کا تارا وہ ذاتِ کریم   جان و دل ماہ پارا وہ خلقِ عظیم
"جس کی ہر ہر ادا واجب الاحترام
اس پہ لاکھوں درود اس پہ لاکھوں سلام

جس کی آمد سے فصلِ بہار آگئی   رحمتِ حق بھی پھر جوش پر آگئی
چھاگئی ہر طرف نور برسا گئی   غم کی ماری تھی دنیا سکوں پاگئی
دور کرنا مصیبت کو تھا جس کا کام
اس پہ لاکھوں درود اس پہ لاکھوں سلام

کارواں گم تھا، تاریک بھر رات تھی   خوفناک ایک جنگل تھا برسات تھی
ساری دنیا تھی کیا بحرِ ظلمات تھی   بدحواسی تھی بگڑی ہوئی بات تھی
آگیا ظلمتِ شب میں ماہِ تمام
اس پہ لاکھوں درود اس پہ لاکھوں سلام

جس نے کندن بنایا مسِ خام کو   جس نے قرباں کیا حق پہ آرام کو
کردیا تھا منور ہر اک گام کو   سارے عالم میں پھیلایا اسلام کو
جس پہ نازل ہوا ہے خدا کا کلام
اس پہ لاکھوں درود اس پہ لاکھوں سلام

معجزہ جس کا ادنیٰ تھا شق القمر   جس کی آمد جہاں میں نسیمِ سحر
اس کی آمد نہ ہوتی جہاں میں اگر   ٹھوکریں کھاتی انسانیت دربدر
لے کے آیا محبت کا دلکش پیام
اس پہ لاکھوں درود اس پہ لاکھوں سلام

وہ ہمارا نبی خاتم المرسلیں   دونوں عالم ہوئے جس کے زیرِ نگیں
ذات ایسی ملے گی بتاؤ کہیں؟   جس پہ قرباں ہوئے آسمان و زمیں
زندگی بھر پلایا محبّت کا جام
اس پہ لاکھوں درود اس پہ لاکھوں سلام

جس کی آمد سے پہلے تھے گھر گھر صنم   مرکزِ شرک سارا بنا تھا حرم
رکھ دیئے شرک پر اپنے دونوں قدم   جس کی عظمت کے شاہد ہیں لوح و قلم
جسکا دونوں جہاں میں ہے اعلیٰ مقام   اس پہ لاکھوں درود اس پہ لاکھوں سلام

پاک دامان و پاکیزہ قلب و نگاہ   حسن وہ چاند بھی بن گیا گرد راہ
کیمیا بن گیا جس پہ ڈالی نگاہ   اس کی عظمت پہ اپنے پرائے گواہ
وہ جمال و جلال اور عالی مقام
اس پہ لاکھوں درود اس پہ لاکھوں سلام

وہ رسولوں میں آخر جو مرسل ہوا   جس پہ قرآن سارا مکمل ہوا
جس کا ہر لفظ و جملہ مُدلل ہوا   قبل کا ہر صحیفہ معطل ہوا
ہوگئے جس پہ دین و شریعت تمام
اس پہ لاکھوں درود اس پہ لاکھوں سلام

تھا جہاں بحرِ ظلمات میں تہ نشیں   لات و عزیٰ کے آگے پڑی تھی جبیں
اس پہ قرباں دیا ہم کو دینِ مبیں   اور عطا کی ہمیں ایک شرعِ متیں
اس نے سب کو بتایا حلال و حرام
اس پہ لاکھوں درود اس پہ لاکھوں سلام

بات مانی جنھوں نے ستائے گئے   آگ کی چادروں پر لٹائے گئے
لا الٰہ کہا تو مٹائے گئے   پھر بھی آوازِ حق وہ لگائے گئے
"جس کے ادنیٰ غلام فاتحِ مصر و شام"
اس پہ لاکھوں درود اس پہ لاکھوں سلام

جن کی کوشش سے بادِ بہاری چلی   جن سے ہر شاخِ گلشن کی پھولی پھلی
وابوبکرؓ و فاروقؓ عثمانؓ علیؓ   مہکی اسلام کی ان سے ہر ہر گلی
ان سبھوں کا نبیؐ ان سبھوں کا امام
اس پہ لاکھوں درود اس پہ لاکھوں سلام

فاطمہ پیاری بیٹی حسین و حسن   پارۂ دل جگر گوشہ جزو بدن
جن سے آراستہ ہے نبی کا چمن   ہیں چمن کے گل و لالہ و نسترن
قابلِ رشک جس کے صحابہ کرام
اس پہ لاکھوں درود اس پہ لاکھوں سلام

دیر سے کہہ رہی ہے درود و سلام   آگیا اے زباں فدویت کا مقام
اب نبی مکرم کا لے پاک نام   ہاں مگر باادب اور بصد احترام
ذات وہ ہے فدا جس پہ ہیں خاص عام
اس پہ لاکھوں درود اس پہ لاکھوں سلام

وہ حبیبِ خدا طاہر و مصطفےٰ   ابطحی، متقی، مجتبیٰ و مرتضےٰ
وہ حجازی وہ مکی وہ ہے مجتبےٰ   طٰہٰ، یاسین وطٰہٰ وہ خیر الوریٰ
وہ مزمل، مدثر وہ مدنی امام
اس پہ لاکھوں درود اس پہ لاکھوں سلام

وہ تہامی، ترازی، یتیم و غنی   وہ رؤف و بشیر و نذیر و نبی
وہ رسول و مذکر امین ہاشمی   وہ ہے امی لقب مرحبا سیدی
جسکا احمد محمدؐ پیارا ہے نام   اس پہ لاکھوں درود اس پہ لاکھوں سلام

وقت کا اہم تقاضہ اور ندوۃ العلماء کا انقلابی قدم

نئے تمدنی و معاشرتی مسائل پر غور کرنے کیلئے مجلس تحقیقاتِ شرعیہ کا قیام

انشیورنس (بیمہ) کے مسئلہ پر تحقیق کا آغاز

مولانا محمد تقی امینی ← مجلس تحقیقاتِ شرعیہ دارالعلوم ندوۃ العلماء

دنیا میں ہمیشہ تغیر و انقلاب ہوتا رہتا ہے ایک ذلیل و پسماندہ قوم ابھرتی ہے، نشوونما پاتی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے تخت و تاج کی مالک بن جاتی ہے، دوسری برسر اقتدار قوم بگڑتی ہے، فساد پھیلاتی ہے اور چند دن کے بعد تخت و تاج سے محروم کر دی جاتی ہے۔

اسی اتار چڑھاؤ اور بناؤ بگاڑ میں زندگی کا راز پوشیدہ ہے اور اسی میں زندگی کی "توانائیاں" پرورش پاکر قیام و بقاء کی ضمانت حاصل کرتی ہیں، دنیا اسی وقت تک ہے جب تک یہ صورت حال قائم ہے اور جب یہ صورت ختم ہو جائے گی تو دنیا خود بھسم ہو کر فنا ہو جائے گی۔

اس تغیر و انقلاب میں ہر جانے والی قوم اپنا اثاثہ و ترکہ چھوڑ کر جاتی ہے اور ہر آنے والی قوم اپنے ساتھ کچھ نیا ساز و سامان لاتی ہے پھر ان دونوں کی آمیزش سے ایک نئی تہذیب و ثقافت وجود میں آتی ہے جس میں صحت و بیماری دونوں کے اسباب مہیا ہوتے ہیں اور جراثیم دونوں کی "نمو" ہوتی ہے۔

نئی تہذیب و ثقافت سے استفادہ میں قوموں کا کردار مختلف ہوتا ہے جو قوم روبہ اصلاح ہوتی ہے وہ جواہر و جراثیم اور صحت و بیماری کے اسباب میں فرق کو ملحوظ رکھتی ہے اور "خذ ما صفا ودع ما کدر" (جو چیزیں اچھی ہیں انھیں قبول کرو اور جو بری ہیں انھیں چھوڑ دو) کے اصول پر عمل کرتے ہوئے اچھائیوں کو اس حد تک قبول کر لیتی ہے کہ برائیاں غیر موثر بن جاتی ہیں۔

اور جو زوال پذیر ہوتی ہیں وہ نظر کی سطحیت و ذہنی کجی کی وجہ سے نہ دونوں میں امتیاز کر پاتی ہے اور نہ اخذ و قبول میں فرق کو ملحوظ رکھتی ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ "زین لھم الشیطان اعمالھم" (شیطان نے ان کے کاموں کو مزین کر دیا ہے) کے مصداق اس کی زندگی میں بہت سی برائیاں اچھائیوں کے روپ میں سرایت کرتی رہتی ہیں اور احساس تک باقی نہیں رہتا ہے۔

لیکن جو قوم موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہوتی ہے اس کا معاملہ زیادہ نازک اور پیچیدہ ہوتا ہے ایک طرف اس کی زندگی آگے بڑھنے پر مجبور کرتی ہے اور دوسری طرف "موت" راہ کے دشوار گذار مراحل پر غالب آنے کی کوشش کرتی ہے، وہ یقیناً آگے بڑھنا چاہتی ہے لیکن بینائی سے محرومی کی وجہ سے کامیاب نہیں ہوتی اور کچھ دیر بعد رکنا پڑتا ہے، پھر مجبوراً اپنی جگہ قائم رہنا چاہتی ہے لیکن قانون فطرت کی خلاف ورزی کی وجہ سے اس میں بھی ناکام رہتی ہے کیونکہ فطرت کا قانون ہے کہ کوئی قوم اپنی جگہ کھڑی نہیں رہ سکتی یا وہ آگے بڑھے گی یا پیچھے ہٹے گی اگر آگے بڑھنے کی اس میں ہمت و صلاحیت نہیں ہے تو وہ لامحالہ پیچھے ڈھکیل دی جائے گی۔ اس کی مثال ایک ایسے کیڑے کی سمجھنا چاہئے کہ جس میں حرکت تو موجود ہے لیکن ابھی آنکھیں نہ کھلی ہوں ظاہر ہے کہ یہ کیڑا نہ آگے بڑھ کر اپنی سمت متعین کر سکتا ہے اور نہ پیچھے ہٹ کر اپنی منزل کو پا سکتا ہے۔

واسدے مسلم قوم ایک عجیب کشمکش میں مبتلا رہے، زندگی کے نئے نظام میں افادی نقطۂ نگاہ سے معتدل انداز میں غور و فکر کی اب تک کوئی باضابطہ کوشش نہیں ہوئی ہے کہ شرعی حیثیت سے کون سی چیزیں بعینہٖ قبول کر لینے کی ہیں اور کن میں معمولی تغیر و تبدل کے بعد قبول کرنے کی گنجائش نکلتی ہے اور کون ایسی ہیں جو حالات کی ناسازگاری کی وجہ سے عبوری دور میں وقتی طور پر گوارا کی جا سکتی ہیں۔

بدقسمتی سے اس سلسلے میں جو خیالات پیش کئے گئے ہیں یا تو ان لوگوں کے ہیں جو اپنے "امانت خانہ" کے اصلی لعل و جواہر کے عوض دوسروں کے ملمع کئے ہوئے خزف ریزوں کو خرید چکے ہیں، یا پھر ان کے ہیں جو لوگوں کی آزاد خیالی و بےباکی سے گھبرا کر تمام چیزوں کو فتویٰ کی حد تک، بائیکاٹ کرنے ہی میں عافیت سمجھ رکھا ہے۔

ظاہر ہے کہ ان دونوں قسم کے خیالات سے نہ کوئی بات بنتی ہے اور نہ قوم کا مسئلہ حل ہوتا ہے جس طرح نئے نقشہ کی تمام چیزوں کو بعینہٖ قبول کر لینا قومی و ملی خودکشی ہے اسی طرح چھوت سمجھ کر سب کو ٹھکرا دینا خودفریبی ہے اور قومی و اجتماعی زندگی کے رموز و اسرار سے عدم واقفیت کا بدترین مظاہرہ ہے۔

خوشی کی بات ہے کہ اس ناگزیر ضرورت اور اہم تقاضا کو پورا کرنے کے لیے ایسے نازک دور میں ندوۃ العلماء نے انقلابی قدم اٹھایا ہے اور "مجلس تحقیقات شرعیہ" کے نام سے ایک مجلس کا قیام عمل میں آگیا ہے جو نئے مسائل میں افراط و تفریط سے ہٹ کر معتدل انداز میں قوم کی رہنمائی کرے گی مجلس نے کام شروع کر دیا ہے اور عنقریب انشورنس (بیمہ) کے مسئلہ پر تحقیق مکمل ہو کر مجلس کا فیصلہ قوم کے سامنے آجائے گا اور اسی طرح ایک ایک دو دو مسئلہ پر تحقیق کے لیے فیصلہ کا اعلان ہوتا رہے گا۔

مزید خوشی یہ ہے کہ مجلس میں ہر طبقہ کی نمائندگی کے لیے حتی الامکان کوشش کی گئی ہے اور بڑی حد تک اس میں کامیابی ہوئی ہے۔ اللہ سے دعا ہے کہ مجلس کو اپنے فرائض کے بجا آوری کی توفیق دے اور اپنی خاص مدد سے اس کی کمزوریوں کو دور کر کے رہنمائی کے قابل بنائیں۔ آمین۔

اللھم ارنا الحق حقاً وارزقنا اتباعہ

وارنا الباطل باطلاً وارزقنا اجتنابہ

شرائطِ ایجنسی

۱۔ ڈیڑھ روپیہ فی کاپی کے حساب سے زر ضمانت پیشگی

۲۔ کمیشن ۱۰ کاپیوں تک ۲۵ فیصدی

۳۔ دس سے زائد کاپیوں پر ۳۳ ۱/۳ فیصدی

۴۔ حساب ماہ بماہ ہر مہینہ کی دس تاریخ تک صاف ہونا چاہئے۔

۵۔ طلب ضرورت کے مطابق ہونی چاہئے کیوں کہ واپسی نہیں ہوگی۔

۶۔ ایجنسی کم سے کم ۵ پرچوں پر دی جائے گی۔

(منیجر)

تاریخ کے دریچے سے

مولانا ابوالعرفان ندوی
قائم مقام مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء

غرباء اور حاجت مندوں کی خبرگیری اور کسی بھوکے خاندان کے لئے قوت لایموت کا انتظام افضل عبادات میں ہے۔ کلام پاک میں اللہ تعالیٰ نے انفاق فی سبیل اللہ کی تاکید فرمائی ہے، اور ایسے لوگوں کے لئے دنیا اور آخرت میں کامیابی کا وعدہ فرمایا ہے۔

اس وقت ہم آپ کے سامنے "دو سچے" واقعے بیان کرنا چاہتے ہیں جس سے اندازہ ہوگا کہ ہمارے بزرگان دین اور ائمہ کرام غرباء اور اصحاب حاجت کی امداد کو کس قدر اہمیت دیتے تھے اور اس کے لئے وہ کیسی کیسی قربانیاں فرماتے تھے:—

حضرت عبداللہ ابن مبارک جو اپنے وقت کے بہت بڑے محدث اور عالم دین تھے اور جن کی بڑائی اور عظمت کے بہت سے واقعات تاریخ کی کتابوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ انھیں کا ایک واقعہ یہ بھی ہے کہ ایک بار سفر حج کے لئے تشریف لئے جا رہے تھے اللہ تعالیٰ نے دولت علم کے ساتھ دولت مال سے بھی نوازا تھا خدم و حشم اور دوسری ضروریات سفر بھی ساتھ تھیں۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ایک گھر سے ایک صاحبزادی نکلتی ہیں اور کوڑے کرکٹ پر ایک مردار پڑے ہوئے پرندے کو اٹھا کر گھر لیجاتی ہیں۔ حضرت عبداللہ ابن مبارک نے جب یہ دیکھا تو ان صاحبزادی کو گھر سے باہر بلوایا اور اس پرند کو ان سے گھر میں لیجانے کی وجہ پوچھی۔ اُس بیچاری نے بتلایا کہ ہم لوگ افلاس و فقر کی وجہ سے اس حالت میں پہونچ گئے ہیں کہ اب ہمارے لئے مردار جائز ہو گیا ہے۔ عبداللہ ابن مبارک نے ناظم سفر کو بلا کر پوچھا کہ:— تمہارے پاس کتنے روپئے ہیں؟— انھوں نے کہا کہ:— ہزار دینار موجود ہیں۔ یہ سُنکر حضرت عبداللہ ابن مبارک نے فرمایا:— یہاں سے گھر واپسی کے لئے بیس دینار کافی ہوں گے، وہ رکھ لو، اور مابقی جملہ رقم ان کو دے دو۔ اور آخر میں فرمایا: "فھذا افضل من حجنا فی ھذا العام" یعنی اس سال سفر حج سے زیادہ بہتر اور کار ثواب یہ ہے کہ سفر حج کے لئے جو رقم موجود ہے وہ ان حاجت مندوں کو دے دیجائے۔ چنانچہ عبداللہ ابن مبارک اپنے وطن مرو تک واپسی کے لئے بیس دینار رکھ کر اور مابقی رقم ان مسکینوں کو دے کر اسی مقام سے اپنے وطن واپس آگئے، اور اس سال حج نہیں فرمایا۔

ایک دوسرا واقعہ بھی ملاحظہ ہو:—

حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ نفلی روزے بکثرت رکھا کرتے تھے۔ اُن کی اخیر عمر کا یہ واقعہ تاریخوں میں محفوظ ہے کہ غذا بہت مختصر بلکہ تقریباً ختم ہو چکی تھی، برائے نام افطار کے بعد سحری کے وقت جب کچھ پیش کیا جاتا تو نوالہ چبا کر اگل دیا کرتے تھے اقبال خادم نے مسلسل اس کیفیت کو دیکھنے کے بعد کہا کہ آپ افطار کے وقت بھی کچھ نہیں کھاتے اور سحری کے وقت بھی یہی حال ہے بڑھاپے کی وجہ سے ضعف یوں بھی ہے اور مسلسل کچھ نہ کھانے سے آپ کی صحت پر بُرا اثر پڑے گا۔ اقبال خادم کی یہ بات سُنکر حضرتؒ رونے لگے اور فرمایا: "جب میں یہ خیال کرتا ہوں کہ اللہ کے کتنے بندے بھوکے اور پیاسے سڑک یا کسی دکان کے کنارے پڑ کر رات گزار رہے ہیں تو نوالہ حلق سے نیچے نہیں اترتا اور مجبوراً اگل دیتا ہوں"

ہم لوگوں کے لئے ایسے واقعات میں بہت ہی درس عبرت ہے،

ہم میں سے کتنے لوگ ہیں جو اس طرح اپنے طے شدہ پروگرام کو اسلئے منسوخ کرتے ہیں کہ اس میں جو مصارف ہونگے وہ کسی حاجت مند کو دے دیں، ورنہ دیکھا تو یہ جاتا ہے کہ اپنے بڑے سے بڑے پروگرام کی تکمیل کے وقت صاحب حاجت اعزہ

اور

پڑوسیوں کو یکسر نظر انداز کر دیا جاتا ہے!

مطالعہ کی میز پر

نصف صدی قبل کی ایک پاکیزہ محفلِ مُشاعرہ

ایک مختصر سی لیکن صاف ستھری محفل مشاعرہ لکھنؤ میں آج سے کوئی پچاس ساٹھ سال قبل آراستہ ہے، طرح کی زمین ہے "ازل سے" "کل سے" ایک شاعر کے سامنے جب شمع آئی تو مطلع ارشاد ہوا ؎

الجھا نہ مرے آج کا دامن کبھی کل سے
مانگی نہ مدد دل نے مرے طول اَمل سے

اور داد کی آوازیں ہر طرف سے آنے لگیں، کلام میں بانکپن تھا ہی اس غضب کا۔ اور اس شعر پر تو محفل لوٹ لوٹ گئی ؎

ان کی نگہِ مست ہے لبریز معانی
ملتی ہوئی تاثیر میں حافظ کی غزل سے

نگاہ یار کی مستی جتنوں نے باندھی ہے اور شراب سے تشبیہ بار ہا دی جا چکی ہے، حافظ کی غزل تک اس کا رتبہ پہونچا دینا یہ اسی شاعر کی جدت طبع کا کرشمہ ہے، اور عجب کیا؟ جو خود خواجہ حافظ کی روح بھی یہ اچھوتی داد سُن کر وجد میں آگئی ہو، اور جب اس شعر کی نوبت آئی ؎

حکم آیا خموشی کا تو بس حشر تلک چپ
بیعت تری پیغام کی ظاہر ہے عمل سے

اور مقطع بعد اس شعر کی ؎

درجہ متغیر کا ہے نوٹ دے فرو تر
ہے روح کو امید ترقی کی اجل سے

تو جو اہل دل تھے اُن آنکھوں میں کچھ بوندیں جھلک آئیں۔ اور اہل معرفت کی زبان پر بے ساختہ مرحبا اور سبحان اللہ کے نعرے جاری ہوگئے — لیکن شاعر نے جب اسی غزل کے ایک شعر کا یہ مصرعہ پڑھا کہ ع

قرآن ہے شاہد کہ خدا حسن پہ خوش ہے

تو سامعین میں ایک بڑے پکے مذہبی شخص، خان بہادر منشی اطہر علی کاکوروی مرحوم موجود تھے، ان کے تیور پر بل سے پڑنے لگے کہ بیچ مذہب میں بھی شوخی ہونے لگی احساس شاعر بھانپ گیا، اور جھٹ پہلے مصرعہ کو مکرر پڑھ، پورا شعر یوں سنایا ؎

قرآن ہے شاہد کہ خدا حسن سے خوش ہے
کس حسن سے، یہ بھی تو سنو حسن عمل سے

شعر کا زبان سے ادا ہونا تھا کہ داد و تحسین کی بارش ہر طرف سے ہونے لگی، اور خان بہادر نے تو بے اختیار اٹھ کر شاعر کو گلے لگا لیا! ان شاعر صاحب کو آپ نے پہچانا۔۔۔؟ یہی تھے سید اکبر حسین اکبر —

مولانا عبدالماجد دریابادی

انشائے ماجد صفحہ ۲۵

مولانا محمد ثانی حسنی

مولانا ولایت علی صاحب عظیم آبادیؒ

"ہم طرزِ جنوں اَور ہی ایجاد کرینگے"

{ حضرت سید احمد شہیدؒ کے جلیل القدر خلیفہ جنھوں نے سید صاحبؒ کے بعد تحریک مجاہدین کے گرتے ہوئے علم کو سنبھالا، اور تحریک کو نیا خون بخشا }

ولادت :

عظیم آباد (پٹنہ) بہار کے محلہ صادق پور میں ۱۲۰۵ھ کو پیدا ہوئے، آپ مولوی فتح علی صاحب کے بیٹے، اور رفیع الدین حسین خاں صاحب کے نواسے تھے، رفیع الدین حسین خاں صوبۂ بہار کے ناظم و رئیس اور عمائد میں تھے۔

تعلیم :

جب آپ کی عمر چار سال کی ہوئی تو شرفاءِ ہند کے معمول کے مطابق پڑھنے کے واسطے مکتب میں بٹھائے گئے۔ سات سال کی عمر آپ کو اتنی لیاقت ہوگئی تھی کہ اپنے استاد (میاں جی) سے تشفی نہیں ہوتی تھی، تو آپ کے والد ماجد مولوی فتح علی صاحب نے خود سبق دینا شروع کیا، جب بارہ سال کی عمر ہوئی تو آپ نے ابتدائی کتابوں سے فراغت حاصل کرلی، آخری اور بڑی کتابیں مولانا محمد اشرف صاحب سے لکھنؤ میں پڑھیں۔

طرزِ معاشرت :

مولانا ولایت علی صاحب اپنے نانا رفیع الدین حسین خاں صاحب کے بڑے لاڈلے اور چہیتے نواسے تھے۔ شروع کی زندگی بڑے آرام و راحت اور مرفہ الحالی میں گذاری، ہر وقت عمدہ ریشمی اور زریں لباس یا ڈھاکہ کی جامدانی و تن زیب کا جوڑا آپ کے زیب تن رہتا تھا، ہر وقت خوشبو و عطر سے معطر رہتے، سونے کی انگوٹھیاں اور چھلّے ہاتھوں میں پڑے رہتے، جب لکھنؤ پہونچے تو وہاں کے شوقین اور خوش پوشاک رنگین مزاج نوجوانوں اور بانکوں میں آپ کا شمار ہونے لگا۔

سید احمد شہیدؒ کی خدمت میں :

مولانا ولایت علی صاحب لکھنؤ میں زیرِ تعلیم تھے کہ اسی درمیان حضرت سید احمد شہیدؒ لکھنؤ تشریف لائے، تو مولانا ولایت علی صاحب اپنے استاد مولانا اشرف صاحبؒ کے حکم سے حضرت سید صاحب کی حالت اور کیفیت معلوم کرنے کے لئے حاضرِ خدمت ہوئے، اور دوسرے روز خود اور مولانا اشرف صاحب تخلیہ میں حضرت سید صاحبؒ سے ملے، اور دریافت کیا کہ اللہ تعالیٰ نے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کو وما ارسلناک الا رحمۃ للعالمین فرمایا ہے، اس کی تفصیل کیا ہے؟ حضرت سید احمد شہیدؒ نے پورے ڈیڑھ گھنٹہ بڑی فصاحت اور پوری وضاحت سے اس مضمون کو بیان فرمایا۔ حضرت سید صاحب کے اس اثر انگیز اور دل پذیر بیان سے ان دونوں حضرات پر رقت طاری ہوگئی، اور دونوں کی داڑھیاں آنسوؤں سے تر ہوگئیں، دونوں نے اپنی بے ادبی معاف کرائی، اور اسی وقت حضرت سید صاحبؒ کے دستِ مبارک پر بیعت کرلی۔

حالت بدل گئی :

حضرت سید صاحبؒ سے بیعت کیا ہوئے کہ مولانا ولایت علی صاحب کیا سے کیا ہوگئے۔ اب وہ عظیم آباد و لکھنؤ کے بانکے نہ تھے، اور ناظمِ بہار کے لاڈلے نہ تھے، بلکہ ایمان و یقین سے سرشار اور محبتِ الٰہی میں غرقاب، حضرت سید صاحبؒ کے ایک ادنیٰ خادم اور جفاکش مزدور تھے۔ اپنی رنگین مزاجی اور خوش پوشاکی چھوڑ چھاڑ حضرت سید صاحب کے ہمراہ تکیہ[1] (دائرہ شاہ علم اللہؒ جو حضرت سید صاحبؒ کا وطن ہے) پہونچے، تکیہ کے قیام میں جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر اپنے سر پر لاتے، کھانا اپنے ہاتھ سے پکاتے، مٹی و گارے کا کام اپنے ہاتھوں سے کرتے، اور جب ان کاموں سے فرصت پاتے اور جماعت کی خدمت سے وقت بچتا تو حضرت سید صاحبؒ کی خدمت میں جا بیٹھتے، یا تنہا نماز و دعا میں مشغول ہوتے۔

مزدور کے بھیس میں :

مولوی فتح علی صاحب جو آپ کے والد تھے انھوں نے اپنے ایک پرانے خدمت گار کو جو ولایت علی صاحب کے بچپن ہی سے خدمت میں رہتا تھا، چار سو روپیہ اور دس بارہ جوڑے کپڑے اور جوتے دیکر مولانا کی خدمت میں بھیجا۔ مولانا اس وقت مصروفِ خدمت تھے۔ خدمتگار نے پہونچتے ہی پوچھا کہ: مولوی ولایت علی صاحب پٹنہ والے کہاں ہیں؟ لوگوں نے بتلایا کہ: دریا کے کنارے گارے مٹی کا کام کر رہے ہیں۔ وہ خدمت گار دریا کنارے گیا، دیکھا کہ مولانا اپنے ساتھیوں کے ساتھ ایک موٹا تہبند وہ بھی سیاہ رنگ کا باندھے گارے میں لتھڑے کام کر رہے ہیں۔ اس قدیمی خدمت گار نے جو بیسیوں سال تک آپ کی خدمت میں رہ چکا تھا آپ کو نہ پہچانا، خود مولانا سے دریافت کیا کہ: مولانا ولایت علی پٹنہ والے کہاں ہیں؟ آپ نے فرمایا: بھائی ولایت علی تو میرا ہی نام ہے۔ خدمت گار جھنجلا کر بولا: میں تم کو نہیں پوچھتا، میں مولوی ولایت علی پٹنہ والے کو تلاش کر رہا ہوں۔ بہرکیف اور لوگوں کے یقین دلانے سے اس کو یقین ہوا کہ مولانا ولایت علی یہی ہیں، اس نے معافی مانگی، آپ نے اس کو گلے لگا لیا، وہ مولانا کی اس حالت کو دیکھ کر زار و قطار رونے لگا، اور وہ تمام چیزیں پیش کیں جو والد ماجد نے بھیجی تھیں، آپ نے اس کو تسلی دی، اور رات کو وہ تمام چیزیں حضرت سید صاحبؒ کی خدمت میں لیکر پہونچے، اور سامنے رکھ کر خاموش واپس چلے آئے اور اسی طرح خدمت میں لگ گئے۔ وہ خدمت گار دو چار روز رکا کہ مولانا وہ چیزیں استعمال کریں، مگر آخر کار مایوس ہوکر واپس چلا گیا، اور مولانا کے والد ماجد سے ساری کیفیت سنادی۔

حضرت سید صاحبؒ سے محبت، اور کمال یگانگت :

مولانا ولایت علی صاحب حضرت سید شہیدؒ کی خدمت میں رہ کر سید صاحبؒ کے رنگ میں ایسے رنگے اور آپ کی محبت میں ایسے ڈوبے کہ خود تو خود اپنے پورے خاندان کو حضرت سید صاحبؒ کا شیدائی اور جان و دل سے فدائی بنا دیا آپ کی ترغیب سے خاندان صادقپور کے تمام خورد و کلاں، مرد و زن حضرت سید صاحبؒ سے بیعت ہوگئے۔

خود مولانا ولایت علی صاحب حضرت سید صاحب کی زندگی میں آپ کے مخلص اور جانباز سپاہی اور محبت و عشق میں چیدہ چور تھے، اور شہادت کے بعد حضرت سید صاحبؒ کی نیابت اور جانشینی کا سب سے زیادہ حق ادا کیا اور آپ کے خاندان نے سب سے گراں قیمت اور بھاری تاوان ادا کیا اور حضرت سید صاحبؒ کے نقشِ قدم پر چل کر سب کچھ فدا کردیا۔

حضرت سید احمد شہیدؒ جب پٹنہ تشریف لے گئے تو مولانا ولایت علی صاحبؒ نے لکھنؤ سے اپنے والد ماجد کو لکھا کہ آپ سب حضرات حضرت سید صاحبؒ سے بیعت ہو جائیں۔ ورنہ ایسا بابرکت شخص پھر نہ ملے گا۔

[1] لکھنؤ سے ۴۹ میل کے فاصلہ پر رائے بریلی کا شہر ہے، شہر سے چند فرلانگ کی دوری پر تکیہ کلاں ایک مختصر سا گاؤں ہے، جو سئی ندی کے کنارے ہے، یہ گاؤں حضرت سید احمد شہیدؒ کے جد امجد اور عارف باللہ حضرت شاہ علم اللہؒ نے بسایا تھا، اور انھیں کی اولاد یہاں آباد ہے، حضرت سید احمد شہیدؒ اسی موضع میں ۱۲۰۱ھ میں پیدا ہوئے۔

باقی آئندہ

عالمِ اسلام

دنیائے اسلام کی سب سے قدیم یونیورسٹی ــــ جامعہ زیتونہ

ابن خلدون اور ابو الحسن شاذلی کی مادرِ علمی

سعید الرحمٰن الاعظمی

جامع زیتونہ اسلامی دنیا کی وہ سب سے قدیم یونیورسٹی ہے جو آج بھی اپنی قدیم روایات اور شاندار ماضی کے ساتھ قائم ہے۔ اس درسگاہ کی تعمیر ۱۴۱ھ میں مکمل ہوئی اور اسی وقت سے اس میں تعلیم کا سلسلہ بھی شروع ہوا، دوسری صدی ہجری کے وسط میں تیونس علی بن زیاد اور عبدالرحیم بن اشرس جیسے بلند پایہ علماء کا گہوارہ رہ چکا ہے۔

ساتویں صدی ہجری کے آغاز میں جب حکومت حفصیہ کا قیام عمل میں آیا تو تونس تمام افریقی ممالک کا دارالسلطنت قرار پایا، اور جامع زیتونہ عالم افریقہ کی سب سے بڑی اسلامی یونیورسٹی ہوگئی، جہاں علماء اور طلباء کی ایک بڑی تعداد جمع ہوئی اور اس کا دائرہ تعلیم پہلے سے بہت زیادہ وسیع ہوگیا، اندلس کے مشہور علماء، مثلاً ابن عصفور، حازم قرطاجنی، ابن ابار قضاعی یہاں آئے، اور جامع زیتونہ میں بہت سے نئے علوم و فنون کی تعلیم کا اضافہ ہوا۔

جامع زیتونہ میں تعلیم کا معیار اس وقت کی دوسری بڑی اسلامی درسگاہوں کی طرح تھا، وہ اپنے علمی ماحول میں بغداد، قاہرہ، قرطبہ، اور نیشاپور کی درسگاہوں سے کسی طرح کم نہیں تھی۔ تعلیمی مراحل میں اعلیٰ تعلیم، ثانوی تعلیم اور ابتدائی تعلیم کے درجات قائم تھے، اس یونیورسٹی سے بڑی بڑی شخصیتیں پیدا ہوئیں جو اسلامی تاریخ میں بلند مقام پر فائز ہیں، چنانچہ ابن عرفہ، عبدالرحمٰن ابن خلدون علامہ تیجانی اور ابوالحسن شاذلی جیسے بلند پایہ اور باکمال لوگ اسی درسگاہ سے فیضیاب ہوکر نکلے۔

اس زمانہ میں ان درسگاہوں کا کوئی باقاعدہ نصابِ تعلیم نہیں تھا، جامع زیتونہ میں پڑھنے والے طلبہ بھی اپنی ہمت اور حوصلے کے مطابق جن علوم کو چاہتے اختیار کرتے اور اس کی تکمیل کرتے، اساتذہ کا مشورہ اور طالب علم کی استعداد اس کے لئے خود نصاب مہیا کردیتی۔

اسی طرح درس و تدریس کے لئے کوئی سند یا ڈگری لازمی نہیں تھی، بلکہ ہر وہ شخص جو اپنے اندر تدریس کی صلاحیت پاتا اور اس کے اساتذہ اس کو اس کا اہل سمجھتے تو وہ منصبِ تدریس پر فائز ہوکر طلبہ کو فائدہ پہونچاتا، تقریباً سات صدیوں تک تعلیم کا یہی حال رہا، تا آنکہ ۱۲۵۸ھ ہجری میں امیر احمد باشا کی توجہ نظامِ تعلیم متعین کرنے کی طرف مبذول ہوئی، اور انھوں نے جامع زیتونہ کے لئے ایک نظام بنایا جس کے ماتحت جامع زیتونہ کے علماء کی جماعت میں سے تیس منتخب مدرس طبقۂ اول میں مقرر کئے اور ان کے لئے مناسب تنخواہ کے ساتھ روزانہ دو سبق پڑھانے کی درخواست کی، اسی طرح طبقۂ ثانیہ میں بارہ مدرسین کا تقرر ہوا لیکن ان کی تنخواہیں طبقۂ اول کے مدرسین سے کم رکھی گئیں، اس طبقہ کے مدرسین کے لئے بھی روزانہ دو سبق پڑھانے کا انتظام ہوا۔

تعلیمی انتظام و امور کی دیکھ بھال اور اساتذہ کے کاموں کی نگرانی کے لئے عدالت شرعیہ کے چار ججوں پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی گئی۔ جو وقتاً فوقتاً تعلیمی رپورٹ کے ذریعہ تعلیمی ترقی اور طلبہ و اساتذہ کے احساس ذمہ داری کی خبر رکھتی تھی ...... اس طرح تھوڑی ہی مدت میں جامع زیتونہ نے علمی میدان میں کافی ترقی کی۔ طلبہ کی کثرت ہوئی تعلیمی شعبوں میں اضافہ ہوا، اور تعلیمی معیار خاصا اونچا ہوگیا۔ انتظام و ترتیب نہایت بہتر ہوگیا، اور دوسرے مدارس میں درس و تدریس کی ذمہ داری سنبھالنے کے لئے جامع زیتونہ کے فارغ شدہ طلبہ کو ترجیح دی جانے لگی۔

طلبہ کی کثرت نے جامع زیتونہ کے تمام شعبوں میں توسیع کا احساس پیدا کیا تو اس کی متعدد شاخیں شہر کی بعض مسجدوں اور دوسرے شہروں میں بھی قائم ہوگئیں، جامع زیتونہ کی ان شاخ درسگاہوں میں ثانوی تعلیم کے ابتدائی مرحلہ کی تعلیم کا انتظام ہوا، یہ مرحلہ چار سالوں میں تقسیم ہوتا تھا، لیکن جامع زیتونہ میں ثانوی تعلیم کے دونوں مرحلوں کی تکمیل تعلیم اور اس کے ساتھ اعلیٰ تعلیم کا بھی نظم تھا جن میں کم از کم دو سال کی مدت درکار ہوتی تھی، لیکن تھوڑی ہی مدت کے بعد جب طلبہ کی بہت زیادہ کثرت ہوگئی، تو جامع زیتونہ نے ثانوی تعلیم کے ابتدائی مرحلہ کی تعلیم شاخوں کے ساتھ مخصوص کردی۔ اور جامع زیتونہ صرف ثانویہ کے دوسرے مرحلہ اور اعلیٰ تعلیم کے لئے مخصوص ہوگئی تھی۔

۱۹۳۳ء میں جامع زیتونہ کا نیا نصاب تعلیم تیار ہوا اور اندلس میں بہت سے نئے علوم و فنون کا اضافہ کیا گیا اور وائس چانسلر کا عہدہ قائم کیا گیا، جس کو شیخ الجامع الاعظم کے نام سے یاد کیا جاتا تھا، اور ماہرین تعلیم کی ایک مخصوص کمیٹی بنادی گئی تاکہ وہ نصاب تعلیم میں برابر تغیر و تبدیلی کے متعلق غور کرتی رہے اور زمانہ کے حالات کے مطابق نصاب بنائے۔

جامع زیتونہ میں درس کا طریقہ یہ ہوتا کہ ہر استاذ اپنا گھنٹہ شروع ہوتے ہی جامع زیتونہ میں پہونچ جاتا، اور کسی ستون سے ٹیک لگا کر بیٹھ جاتا، اور طلبہ اس کے اردگرد حلقہ بنا کر بیٹھتے۔ اور گھنٹہ ختم ہوتے ہی درس بھی ختم ہو جاتا اور وہ طلبہ دوسرے استاذ کے پاس چلے جاتے۔

تونس میں جب عوامی حکومت کا دور شروع ہوا تو جامع زیتونہ میں بھی انقلاب آیا اور وہ یہ کہ ثانوی تعلیم جامع زیتونہ سے ختم کرکے اس کو محض اعلیٰ تعلیم کے لئے مخصوص کردیا گیا، اور اعلیٰ تعلیم سے ماسبق تعلیم شاخوں کے ذمہ کردی گئی۔

اور اسی کے ساتھ جامع زیتونہ کو یونیورسٹی کا لقب عطا ہوا اور شیخ الجامع الاعظم عمید الجامعۃ الزیتونیۃ کے نام سے یاد کئے جانے لگے۔ اس وقت زیتونہ یونیورسٹی میں دو کالج قائم ہیں، ایک کلیۃ العلوم الشرعیۃ کے نام سے اور دوسرا کلیۃ العلوم اللغۃ العربیۃ کے نام سے، اس کالج میں عربی زبان و ادب اور اس کی تاریخ کے ساتھ بلاغت قرآن، اصول لغت، نقد، مشاہیر ادباء کا تحلیلی مطالعہ، علم النفس، قدیم زبانوں کی تعلیم، عامی اور زندہ زبانوں کی تعلیم اور خطابت واصول خطابت اور تاریخ عرب وغیرہ کی تعلیم کا مکمل انتظام ہے، اور ان تمام علوم و فنون کے لئے مشہور و مستند اساتذہ رکھے گئے ہیں۔ ان دونوں کالجوں کی مدت تعلیم تین تین سال ہے۔

زیتونہ یونیورسٹی میں دو کتب خانے ہیں۔ ایک کا نام المکتبۃ الاحمدیۃ ہے۔ جس کو امیر احمد باشا اول نے ۱۲۵۶ھ میں قائم کرکے جامع زیتونہ کے لئے وقف کیا تھا، اس وقت اس کتب خانے میں کل ۵۰۰۰ کتابیں ہیں جن میں اکثر قلمی ہیں۔ دوسرا کتب خانہ المکتبۃ الصادقیۃ ہے۔ اس کو وزیر خیرالدین تونسی نے ۱۲۹۲ھ میں قائم کیا تھا، اس میں ۳۰۰۰ کتابیں ہیں

مجلس تحقیقات ونشریات اسلام کی چند اردو مطبوعات

مقالات سیرت

مرتبہ: ڈاکٹر محمد آصف قدوائی ایم اے، پی ایچ ڈی

سیرت محمدی کے موضوع پر دنیا کی مختلف زبانوں میں جو لکھا گیا ہے اسکا شمار مشکل ہے، اردو اس باب میں خاص امتیاز رکھتی ہے جسمیں بڑی سے بڑی ضخیم کتابیں لکھی جاچکی ہیں، لیکن ڈاکٹر آصف نے مقالات سیرت کے نام سے یہ کتاب تعلیم یافتہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کیلئے سیرت کے مختلف پہلوؤں پر لکھی ہے۔

کتابت وطباعت دیدہ زیب، سائز ۱۸×۲۲ صفحات ۲۸۰، قیمت مجلد مع گرد پوش ۴/۵۰

طوفان سے ساحل تک

مرتبہ:۔ محمد اسد (سابق لیوپولڈ ویس)

ترجمہ:۔ محمد الحسنی (مدیر البعث الاسلامی)

اس کتاب میں مغربی زندگی کے اس طوفان کی تصویر پیش کی گئی ہے جس سے گزر کر محمد اسد صاحب قلبی و روحانی سکون کے ساحل تک پہونچے اور ایمان سے بہرہ یاب ہوئے، اس میں مغربی تہذیب کی مکمل تصویر بھی ہے اور اسلامی معاشرہ کی خصوصیات پر بہت خوبی کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے۔ مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کے مفصل مقدمہ کے ساتھ۔

کتابت، طباعت معیاری، کاغذ اعلیٰ، قیمت:۔ مجلد پانچ روپے

ہندوستانی مسلمان

مرتبہ:۔ مولانا سید ابو الحسن علی ندوی

ہندوستان کی تاریخ میں مسلمانوں کا کردار، انکے شہرۂ آفاق علمی و تعمیری کارنامے، زندگی و تمدن پران کی گہری چھاپ، جنگ آزادی میں قیادت و رہنمائی، اور انکے موجودہ مسائل ـــ یہ کتاب درحقیقت سینکڑوں کتابوں کا خلاصہ ہے۔

مجلد سہ رنگا گرد پوش قیمت ۳/۵۰ عربی ایڈیشن ۳/۵۰ انگریزی ۶/-

مجلس تحقیقات ونشریات اسلام ندوۃ العلماء لکھنؤ

سائنس کی دنیا

تیس لاکھ سال کی مسافت

جسے انسان اپنی زندگی میں طے کر سکے گا

مصنفہ
البرٹ روزنفیلڈ
ترجمہ
سید ضیاء الحسن ندوی

زمین کے گرد امریکی خلاباز گارڈن کوپر کے ۲۲ چکروں کی تکمیل ایسے نئے دور کا پیغام ہے جس کا علم اپنے نظریہ اضافت کی بنا پر آئنسٹائن کو پہلے ہی ہوچکا تھا۔

کوپر کی عمر کم ہوگئی۔

گارڈن کوپر کے حوصلہ مندانہ خلائی سفر کا ایک دلچسپ نکتہ جس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ یہ ہے کہ اس سفر نے کوپر کو کمسن بنا دیا ہے، ساتھ ہی اس کی گھڑی بہت دھیمی چلنے لگی ہے۔ حالانکہ کوپر اور اس کے ساتھی اس اختلاف کو قطعی محسوس نہیں کر سکتے، اس لئے کہ زمین کے گرد ہر چکر میں جسے کوپر نے نوے منٹ میں پورا کیا ہے۔ اس کی عمر کا اس سے بھی مختصر لمحہ صرف ہوا ہے۔ جتنا کیپ کناویرال کے اڈے پر اس کے ایک سکنڈ کے دس لاکھویں حصہ بھر رک جانے میں صرف ہوتا، اور چوبیس گھنٹے کی گردش کے دوران اس کی گھڑی، ایک سکنڈ کے صرف ساٹھ ہزارویں حصہ کے برابر سست ہوئی کوپر اور اس کی گھڑی کی یہ آہستہ روی، اس کی برق رفتار گردش کا نتیجہ ہے۔ اس آہستگی کی مقدار کا صحیح اندازہ، آئن سٹائن کے نظریہ اضافت کی تعدیل یعنی Equation کے ذریعہ کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح سائنسدان اوقات کے اس فرق کا اندازہ اپنی گھڑیوں کے ذریعہ کر سکتے ہیں، باوجود اس کے کہ اس فرق کی مقدار اتنی قلیل ہے کہ ریاضی دانوں اور فلسفیوں کے سوا، کسی اور کو اس سے دلچسپی نہیں ہو سکتی، پھر بھی ساڑھے سترہ ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار، جس سے آج کے خلاباز گردش کرتے ہیں، محض ابتدائی حیثیت رکھتی ہے۔ مستقبل میں خلائی مسافروں کے کاروان حیات کی سبک خرامی بہت ہی حیرت انگیز ثابت ہوگی کیونکہ وہ سیاروں کی درمیانی مسافت اتنی تیزی سے طے کریں گے کہ اس کا تصور بھی ہمارے لئے ایک مشکل کام ہے۔

اگر آئن اسٹائن کے نظریات کو صحیح مان لیا جائے جس کا اکثر سائنسدانوں کو یقین ہے۔ تو ہماری اس حقیقی دنیا کے متعلق بہت سی بعید از امکان باتیں سچ ثابت ہو سکتی ہیں۔

> شدید کشش کے منطقہ میں گھڑی کی رفتار سست ہوجاتی ہے

آئنسٹائن کے متعدد غیر معروف نظریات میں ایک نظریہ "تضاد اوقات" (گھڑیوں کے اختلاف) کا بھی ہے۔ یہ تضاد اس امر سے ثابت ہو جاتا ہے کہ گھڑیاں بعض خاص حالات میں بہت سست چلتی ہیں۔ اگر کوئی گھڑی نہایت تیز رفتاری کے ساتھ ایک جگہ سے دوسری جگہ کو منتقل کی جائے یا کسی شدید کشش والے علاقہ میں پہنچا دی جائے، تو وہ بھی سست ہو جاتی ہے۔ اگر سورج پر کوئی گھڑی پہنچ جائے تو وہ اس رفتار سے نہیں چل سکتی جس سے زمین پر چلتی تھی، اس لئے کہ سورج میں زمین سے کہیں زیادہ کشش پائی جاتی ہے۔

اسی طرح اڑتے ہوئے خلائی جہاز میں رکھی ہوئی گھڑی بھی اتنی تیزی سے وقت نہیں دے سکتی جیسے زمین پر دیا کرتی تھی، ٹھیک یہی اصول اس جہاز میں بیٹھے ہوئے آدمی پر بھی پورا اترتا ہے، وہ بھی گھڑی کی سستی کو محسوس نہیں کر سکتا کیونکہ اس کے جسم کی مشین کا ہر پرزہ سست روی سے تقریباً اسی قدر متاثر ہے، اور اس کے باوجود کہ اسے کسی چیز کی تبدیلی محسوس نہیں ہوتی۔ اس کی زندگی کی رفتار بھی دھیمی ہوتی جاتی ہے۔ جب وہ اپنے خلائی سفر سے واپس آئے گا تب اسے محسوس ہوگا کہ جسمانی ہیئت یا ظاہری شکل و صورت میں وہ اپنے اس توام بھائی کی بنسبت کم عمر ہے جو زمین ہی پر رہ گیا تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک خلائی سیاح نہایت دور دراز اور برق رفتار خلائی سفر سے جب واپس آئے تو خود کو اپنے توام بھائی کے بیٹوں پوتوں سے بھی کم سن محسوس کرے۔ مستقبل کی دنیا کی جانب انسان کے واقعی کوچ کا نتیجہ یہی کچھ ہوتا ہے، جیسے انشاء پرداز ایچ۔ جی ویلز کے مشہور افسانہ "اشہب دوراں" کا ہیرو صحیح معنوں میں سوار اشہب دوراں معلوم ہونے لگا۔

آئن اسٹائن کے نظریات متعدد تجربوں کے بعد یقینی شکل اختیار کر چکے ہیں، چنانچہ آسمان کے سب سے زیادہ چمکدار ستارے "شعریٰ" کے نزدیک ہی ایک اور ستارہ ہے جو یہاں سے نظر نہیں آتا، وہ ایک ماتحت ہے، اور اس صنف سے متعلق ہے، جسے ماہرین فلکیات "القزم الابیض" کے نام سے موسوم کرتے ہیں، کیونکہ ان میں

> بعض ستاروں کی ایک مکعب انچ مٹی ایک ٹن وزن کی ہے

بہت اونچے درجہ حرارت کے ساتھ انتہائی بھاری پن پایا جاتا ہے اور اسکے باوجود کہ وہ زمین سے تین گنا بڑا ہے، اس کا مادہ نہایت سخت اور ٹھوس ہے۔ یہاں تک کہ اس کا ایک مکعب انچ ایک ٹن (مادۂ ارضی) مٹی کے برابر وزن رکھتا ہے اس کی وجہ سے اس پر ایک نہایت طاقتور حلقۂ کشش تیار ہو جاتا ہے، جو آئن اسٹائن کی رائے کے مطابق اس سے پھوٹنے والی شعاعوں کے بہت تاریک اور تفصیلی تجزیہ سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ ان کی کپکپاہٹ میں سستی ٹھیک اسی مقدار میں آتی ہے، جس کی پیشین گوئی آئنسٹائن کر چکا ہے۔

> دل کی دھڑکن بھی سست پڑ جائے گی

سائنسدانوں کا خیال ہے کہ اگر انسان اس ستارے جیسی کشش رکھنے والے کسی علاقے میں زندہ رہ سکے تو اس کے دل کی دھڑکنیں ستارے کی کشش کے حساب سے ہلکی پڑ جائیں گی۔

کیلیفورنیا یونیورسٹی کے ایک ماہر طبیعیات Physiologist اڈون میک ملن نے حال ہی میں بڑے طول طویل اور تھکا دینے والے حساب کے بعد انکشاف کیا ہے کہ خلائی کشتی کے لئے ایک سے دوسرے کہکشاں (milky-way) تک سفر کرنا، پھر وہاں سے واپس آجانا ممکن ہے، اس طرح وہ خلائی مسافر جن کی عمر میں وہاں کے حساب سے صرف پچپن سال کا اضافہ ہوا ہے، جب زمین پر واپس آئینگے تو یہاں تیس لاکھ سال گزر چکے ہوں گے۔ اس طرح خلائی سفر کا نتیجہ کسی کے لئے فرحت بخش ہونے کے بجائے بعض اوقات نہایت غم انگیز ہوگا۔ بس ایک پرخطر اور جرات مندانہ سیاحت کے سوا کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔

ناخوش گوار سفر تو ایک خلاباز۔ مثال کے طور پر گارڈن کوپر مستقبل میں جب اس سے بھی چھوٹے خلائی سفر سے جیسا پچھلے برس وہ کر چکا ہے، واپس آئے گا تو اپنے خاندان والوں اور دوستوں کو دہشت انگیز حد تک بدلا ہوا پائے گا، اور کبھی جب وہ نسبتاً زیادہ طویل سفر سے لوٹے گا تو دیکھے گا کہ جن لوگوں نے اسے خلائی سفر پر روانہ کیا تھا وہ اب اس کی واپسی کوئی دلچسپی نہیں لیتے ہیں، بسا اوقات ان لوگوں میں کوئی اسے زندہ بھی نہ ملے گا، کبھی مختلف سیاروں اور کہکشاں وغیرہ کے طویل ترین سفر سے واپسی پر اسے معلوم ہوگا کہ وہ ستارے جو پہلے بڑے پر رونق اور آباد تھے، اب انسانی زندگی کے آثار اور امکانات تک سے محروم ہو چکے ہیں۔

(ماخوذ از "لائف" جولائی ۱۹۶۳ء۔ امریکی میگزین)